ماہنامہ المرشد چکوال

قد افلح من تزکی و ذکر اسم ربہ فصلی (القرآن الکریم)

وہ فلاح پا گیا جس نے تزکیہ کر لیا اور اپنے رب کے نام کا ذکر کیا پھر نماز کا پابند ہو گیا

المجاھد من جاھد نفسہ (حدیث شریف)

مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کے خلاف جہاد کرے

بیادِ

شیخ العرب والعجم صدیق دوراں مجدد طریقت مجتہد فی التصوف بحر علوم شریعت

امام اولیاء شیخ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ حضرت العلام قلزم فیوض برکات

اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ

دار العرفان منارہ ضلع چکوال

اداریہ

دعوتِ حق

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی دعوت کا بنیادی نقطہ اور نچوڑ دعوت الی اللہ اور دعوت الی الحق رہا ہے۔ یعنی مخلوق کا تعلق خالقِ حقیقی سے مضبوطی سے جوڑا جائے۔ یہی دعوت نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے خطبۂ اوّل میں ارشاد فرمائی۔ فرمایا قُوْلُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْنَ۔ پڑھو لا الٰہ الا اللہ اور فلاح پاجاؤ۔ گویا اللہ کی وحدانیت کا اقرار اور اللہ سے تعلق دنیوی و اُخروی فلاح کامیابی کی ضمانت ہے۔ لہٰذا یہ تعلق سب تعلقات سے اعلیٰ وارفع اور بڑا قیمتی ہے مگر اس تعلق کے چند بنیادی تقاضے ہیں۔ اوّلاً اللہ کا تعلق اور اُس کی محبت، دل کی گہرائیوں میں اس طرح اُتر جائے کہ جسم الوجود سے سارے وسواس مٹ جائیں۔ اور قلب تجلیاتِ باری کا آئینہ اور محور و مرکز بن جائے۔ ثانیاً اس مقدس دعوت کا دوسرا حصہ محمد رسول اللہ، ہے یعنی پورے خلوصِ نیت کے ساتھ اقرار و تسلیم رسالت ہو۔ اس حصے کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ اطاعت و اتباع و محبت، حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قول و فعل میں رچ بس جائے۔ غلامیٔ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طوق اتنی مضبوطی کے ساتھ پہنا جائے کہ ساری خواہشات آرزوئیں، تمنائیں تابع ہو جائیں اتباعِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے۔

غلامیٔ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نمونہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مبارک زندگیوں میں ملاحظہ کریں۔ آپؐ کی نورانی تعلیمات اور باطنی فیوض و برکات

نے ایسے افراد تیار کیے جو نہ صرف قول و فعل و عمل میں مثالی انسان بن گئے، بلکہ قیامت تک کے انسانوں کے لیے چمکتے ہوئے نشانِ منزل، دینِ متین میں حجت اور معیارِ حق بن گئے جنہیں اللہ تعالیٰ نے پیامبرِ حق کی دعوت کو ساری دنیا تک پہنچانے کا واسطہ اور ذریعہ بنایا۔ اس مقدس جماعت نے دعوتِ حق کے اس مقدس فریضہ کی ادائیگی میں گھر، مال، اولاد تو کیا؟ خون کا آخری قطرہ بھی لگا دیا۔ یہ نبیٔ برحقؐ کی وراثت کا سلسلہ تابعین اور تبعِ تابعین سے چلتا ہوا علماءِ ربانی اور صوفیاءِ عظام کے ذریعہ قیامت تک انشاء اللہ چلتا رہے گا۔

اس دعوتِ حق کے حقیقی حامل وہ علماءِ ربانی ہیں جو نبیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات (قرآن و سنت) اور باطنی انوار و فیوض و برکات کے امین ہیں۔ باطنی انوار اس انعکاسی کیفیت کا نام ہے جس کی ایک نگاہ نے کسی شخص کو صحابی بنا دیا۔ کہاں سے اُٹھا کر کہاں پہنچا دیا۔ اللہ اللہ! — یہ سلسلہ الحمدللہ سینہ بسینہ چلتا آیا۔ اور انشاء اللہ چلتا رہے گا۔ دعوتِ حق بلاشبہ دونوں قسم کی تعلیمات اور کیفیات کا نام ہے —

الحمدللہ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ، اسی دعوتِ حق کا امین ہے اور اسی دعوتِ حق کے ذریعہ رضائے الٰہی کے حصول کا آرزومند اور متمنی ہے۔

(مدیر)

باتیں اُن کی خوشبو خوشبو

ارشادات حضرت مولانا اللہ یار خانؒ

فرمایا: کتاب و سنت اجماعِ صحابہ اور عقلی دلائل سے ثابت ہے کہ رُوح ایک جسم ہے جو اپنی ماہیت کے لحاظ سے اس محسوس جسم عنصری کے مخالف ہے - وہ جسم نورانی، ہلکا، زندہ اور متحرک ہے جو تمام اعضا بدن میں نفوذ کر جاتا ہے۔ بدن میں اس کا سریان ایسا ہے جیسے گلاب کے پھول میں پانی، زیتون میں روغن اور کوئلہ میں آگ کا سریان ہوتا ہے۔ رُوح کا جسم لطیف ہونا اور اس جسم عنصری کا مخالف ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے۔

"پس جب بدن آدم کو پورا بنا چکوں اور اس میں رُوح پھونک دوں۔"

قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ " کہہ دو کہ رُوح تو میرے رب کے امر سے ہے۔"

اگر اس کی پیدائش کسی مادہ مثلاً پانی، ہوا آگ یا نور سے ہوتی تو اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ نور سے بھی زیادہ لطیف ہے۔

فرمایا: رُوح عالم امر کی چیز ہے۔ جب عقلِ انسانی عالم امر کا ادراک کرنے سے قاصر ہے، تو عالم امر کی چیزوں کا ادراک کیونکر کر سکتی ہے اس لیے علوم عقلی یا علوم ظاہری سے رُوح کی معرفت بالکنہ محال ہے۔ درحقیقت رُوح کی معرفت کا تعلق دلائل ذوقیہ، نورِ بصیرت یعنی کشف سے ہے۔ اور جب دلائل ظاہریہ، ذوق اور کشف کی تائید کر دیں تو نورٌ علیٰ نور ہے۔

جہاں تک ذوق اور کشف کا تعلق ہے اس بارے میں صرف محققین اصحاب کشف اور ارباب ذوق کا فیصلہ ہی حجت قرار دیا جاسکتا

ہے اور دیا جانا چاہیے۔ محققین صوفیہ کاملین اصحابِ کشف کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ جسم لطیف نورانی ہے۔ اس کی شکل اس جسم کی شکل کے عین مطابق ہوتی ہے جس بدن کا وہ روح ہے قدر و قامت اور ہیئت میں ہو بہو اس جسم کے مطابق ہوتی ہے۔

فرمایا روح جسم مادی ہے لطیف ہے نورانی ہے جس بدن میں وہ ہے اسی کی شکل پر ہے بدن سے جدا ہونے کے لیے اس کے لیے جسم مثالی کی ضرورت نہیں اس کی تفصیل یہ ہے کہ سب سے پہلے یہ معلوم کر لینا چاہیے کہ حیات کسے کہتے ہیں۔ حیات نام ہے حس و حرکت، دیکھنا، سننا، بولنا، قویٰ ظاہری و باطنی کا موجود ہونا۔ روح دنیا میں بدن کو زندگی بخشتا ہے۔ دنیا میں مادی چیزوں کو سنانے میں مادی آلات کا محتاج ہے نہ کہ اپنی حیات میں مادی بدن کا محتاج ہے بلکہ روح بدن کو حیات بخشتا ہے برزخ میں جا کر روح مادی دنیا کو اپنی آواز نہیں سنا سکتا۔ اس لیے مادی آنکھیں اسے نہیں دیکھ سکتیں۔ مادی کان اس کی بات نہیں سن سکتے حالانکہ وہ خود بولتا ہے سنتا ہے۔ اس کے سارے اعضاء ذاتی ہیں۔ روح خود جسم لطیف، اس کے کان لطیف، اس کی آواز لطیف، اس کو تمام لطیف چیزیں لیتی ہیں اس کی آواز سن لیتی ہیں جیسا ملائکہ، قلوب، انبیاء، قلوب اولیاء لطیف چیزوں کو دیکھنے یا سننے سنانے میں کسی غیر جسم کے آلات کا محتاج نہیں۔

فرمایا عالم برزخ، قیامتِ صغریٰ ہے جہاں روح زندہ رہتی ہے اور عالمِ آخرت، قیامتِ کبریٰ ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

"یقیناً آخرت کا گھر ہی تو زندگی ہے"

اور ظاہر ہے کہ دنیا کی زندگی کے مقابلے میں اکمل زندگی ہے دنیا اور اس کی ہر شے کے لیے موت اور فنا ہے مگر آخرت کی زندگی ابدی ہے۔ اس لیے دارِ آخرت کی ہر شے کیا جزو کیا کل موت سے پاک ہے۔ جب روح کے لیے جزا و سزا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ زندہ ہے کیونکہ مردہ اور معدوم کے لیے جزا و سزا نہیں اس لیے روح سنتی ہے دیکھتی ہے بولتی ہے بلکہ اس کی ساری قوتیں اور تمام صلاحیتیں اسی جگہ کامل درجے پر معرضِ اظہار میں آتی ہیں۔

فرمایا: اہلِ سنت والجماعت کا اجمالی عقیدہ یہ ہے کہ برزخ میں روح بالذات معذب ہے اور بدن تابعِ روح ہوتا ہے۔

اسرار التنزیل

عورتوں کے حقوق

حضرت مولانا محمد اکرم مدظلہ العالی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ
اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ
بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ
عَنِ الْمُنْكَرِ . . . . . .
. . . . ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

(سورہ توبہ ۷۱)

قرآن کریم کا اندازِ دعوت یہ ہے کہ یہ عمومی طور پر کبھی ساری انسانیت کو خطاب فرماتا ہے۔ کبھی کافر سے بات کرتا ہے اور کبھی مومن سے۔ تین ہی انداز ہیں اس کے۔ جب انسانیت سے خطاب فرماتا ہے تو اس میں مومن کافر سب شامل ہوتے ہیں یا پھر ساری انسانیت کو دو حصوں میں بانٹتا ہے۔ ایک مومن اور دوسرے کافر۔ تیسرا کوئی طبقہ قرآن حکیم کے نزدیک نہیں ہے۔ تو جب یہ عمومی خطاب فرماتا ہے انسانیت کو تو اس میں مرد و عورت سب شامل ہوتے ہیں۔ عورت عورت ہونے کے باوجود خود بحیثیتِ انسان وہی حقوق رکھتی ہے جو مرد کے ہیں۔ انسانی حقوق میں مرد و عورت میں فرق نہیں ہے۔ یہ بھی انسان ہے وہ بھی انسان ہے۔

قرآنِ پاک کافر سے جب بات کرتا ہے تو صرف کافر قوم کی بات نہیں کرتا کوئی بھی کافر ہو مرد ہو یا عورت۔ اسی طرح جب مومن سے خطاب فرماتا ہے تو مومن سے مراد مومن مرد اور

مومن عورتیں ہیں، دونوں کو شامل کرتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوا کہ بعض صحابیات نے عرض کی یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے خطاب کے سارے صیغے مذکر معلوم ہوتے ہیں جیسے قرآن کریم صرف مردوں سے بات کرتا ہے۔ فرمایا ایسی تو کوئی بات نہیں ہے قرآن حکیم جب مومن کی بات کرتا ہے تو مومن سے مراد مومن مرد و عورت ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود اللہ جل شانہٗ نے تشریح فرمادی۔ بات کو زیادہ واضح فرمایا۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۔ کہ مومن مرد اور مومن خواتین یہ ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ یعنی زندگی کی گاڑی کو کھینچتے ہیں۔ عورت کے فرائض جداگانہ ہیں مرد کے فرائض جداگانہ ہیں اُن کی ذمہ داریاں الگ ہیں بلحاظ صنف کے۔ لیکن بلحاظ ایمان کے دونوں مومن ہیں۔ ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں ہی يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۔

دونوں ہی بھلائی کا حکم کرتے ہیں برائی سے منع کرتے ہیں اللہ کی عبادت کرتے ہیں اللہ اللہ کرتے ہیں اور اپنے رسول کی اطاعت کے لیے کمربستہ رہتے ہیں۔ ان امور میں دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ جو ہیں يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جس طرح علم دین اور ضروریات دین سے واقف ہونا مرد کے لیے ضروری ہے بعینہٖ اسی طرح عورت کے لیے بھی ضروری ہے کہ اُسے دین کی تعلیم دی جائے اور جس طرح مرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ دین کی بات دوسروں تک پہنچائے۔ اسی طرح خواتین کے لیے بھی ضروری ہے کہ دین سیکھیں اور سکھائیں۔ دیکھیں یہاں کوئی فرق نہیں ہے کسی درجے میں بھی امر بالمعروف دونوں نیکی کا حکم کرتے رہیں۔ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ اور برائی سے منع کرتے رہیں۔ اب نیکی اور برائی سے جو شخص واقف ہی نہیں ہوگا، جو خود نہیں جانتا کہ جائز و ناجائز کیا ہے۔ حلال و حرام کیا ہے پاک و پلید کیا ہے کونسی چیز حرام ہے کونسی چیز مکروہ ہے کونسی مستحب ہے کونسی جائز ہے کونسی فرض ہے سنت ہے واجب ہے وہ دوسروں تک کیسے پہنچائے گا۔ بات آگے پہنچانے کے لیے بات کا جاننا ضروری ہے۔ تو گویا اس

دینی علم بچوں کے لیے یا مردوں کے لیے ضروری ہے اُس کا اہتمام کیا جاتا ہے اتنا ہی ضروری خواتین کے لیے اور بچیوں کے لیے ہے جس کا کبھی اہتمام نہیں کیا جاتا۔ زندگی کا یہ پہلو چھوڑ دیا ہے۔ کچھ عورتوں کا مزاج ایسا ہے کہ وہ اپنی ساری کوشش محض گھر کو بنانے مکان کو سنوارنے اور زیادہ سے زیادہ بچوں کو نہلانے دھلانے میں صرف کر دیتی ہیں وہ خود بھی پرواہ نہیں کرتیں کہ یہ سب کچھ اِس دنیا کا ہے اور ہمیں یہاں سے آگے بھی جانا ہے۔

اور سب سے بڑی غفلت مرد حضرات کی طرف سے ہوتی ہے کہ ہم مرد اس ضرورت کو محسوس ہی نہیں کرتے اور اچھے بھلے دیندار لوگوں کے گھروں میں دینی علم بہت کم ہوتا ہے۔ بڑے بڑے فاضل لوگ بڑے بڑے عالم لوگ دیکھیں اُن کے گھر میں اُن کی خواتین، بیویاں، بیٹیاں اور بہویں دینی علم سے آراستہ نہیں ہوتیں۔ بہت کم خوش نصیب ہوتے ہیں جو یہ کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن حکیم کی نگاہ میں مرد و عورت میں کوئی فرق نہیں ہے۔

جس طرح مرد صاحبِ تصنیف ہوتا ہے، عورت کو بھی صاحبِ تصنیف ہونے کا حق ہے۔ اتنا علم حاصل کرے کہ وہ بھی لکھ سکے۔ جس طرح مرد دین کو بیان کرتے ہیں عورتوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ خواتین کو جمع کر کے انہیں دین سمجھائیں جس طرح مرد عبادات پہ کمربستہ رہتے ہیں اُسی طرح خواتین کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ عبادات کو ہاتھ سے جانے نہ دیں۔ یہ جو ہم نے تقسیم کر لیا ہے نا کہ بچوں کا لباس تبدیل کرنا اور گھر کا کھانا پکانا یہ صرف عورتوں کی ذمہ داری ہے۔ یہ شرعاً درست نہیں ہے۔ یہ تو بجا ہے کہ باہر مزدوری مرد کو کرنا ہے۔ اُس نے کما کر لانا ہے، عورت یعنی خاتونِ خانہ کے سپرد کرنا ہے لیکن بات یہاں ختم نہیں ہو جاتی۔ اگر وہ گھر آ کر خاتونِ خانہ کا ہاتھ بٹا لیتا ہے۔ بچوں کو نہلانے میں مدد کرتا ہے۔ یا یہ ہانڈی پکا رہی ہے یہ اُسے دھل پکڑا دیتا ہے تو یہ نہ صرف سب درست ہے بلکہ ضروری ہے اور یہ سنّت ہے آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی۔ کہ حضور جب گھر تشریف لاتے یا گھر موجود ہوتے تو گھر کے کاموں میں ازواجِ مطہرات کا ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔ بلکہ بڑا عجیب واقعہ ملتا ہے کہ کسی سفر کی روانگی کے وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجدِ نبوی سے فارغ ہو کر از راہِ خانہ

حجرۂ مبارک میں تشریف لائے تو آپؐ نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا کہ مجھے جلدی جانا ہے۔ اگر کھانا جلدی دے دو۔ صحابہ تیار ہیں جلدی روانہ ہونا ہے۔ انہوں نے عرض کی یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں آٹا تیار کرتی ہوں پھر چولہا جلاتی ہوں۔ فرمایا نہیں آٹا مجھے دے دو آٹا میں تیار کرتا ہوں تم آگ جلاؤ جلدی ہو جائے گا — تو نبی مبارک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ مبارک سے آٹا گوندھا۔ انہوںؓ نے آگ جلائی اس پر توا وغیرہ رکھ کر اس پر روٹی ڈالی تو بیٹھے انتظار کرتے ہیں۔ ویسے آگ جل رہی ہے توا گرم ہے لیکن آٹا جیسا اس پر ڈالا گیا ویسے کا ویسا ہے تو بجائے جلدی ہونے کے اس میں تاخیر ہونا شروع ہوئی — حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عائشہ ہم سے تھوڑی سی چوک ہو گئی جس آٹے میں میں نے ہاتھ ڈالے ہیں اس پر آگ اثر نہیں کرے گی۔ کوئی اور چیز گھر میں ہے تو وہ دے دو کہ اب یہ روٹی پکنے سے رہی — یعنی اس حد تک حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہاتھ بٹاتے تھے۔ دودھ دوہ دینا یا بازار سے سودا لے آنا آپؐ کا معمول تھا —

اور یہ اس لیے ضروری تھا ہے کہ مرد حضرات جو کچھ باہر سیکھتے ہیں عملی طور پر ساتھ شامل ہو کر خواتین کو سکھائیں۔ ہم سے یہ پہلو اس قدر چھوٹ چکا ہے ہم اتنے دور جا چکے ہیں کہ جب ہم نے یہاں دارالعرفان میں خواتین کی تربیت کا اہتمام کیا خواتین کو اجازت دلا آنے کی دین سننے سیکھنے اور سمجھنے کی اور عملی تربیت حاصل کرنے کی تو کونسا فتویٰ ہے جو اس پر داغا نہیں گیا — یعنی ہم نے نہ صرف اسے چھوڑ دیا ہے بلکہ ہم اس کے خلاف پوری کوشش کرتے ہیں کہ عورتوں کو کوئی بات نہ بتائی جائے اور یہ صریح [illegible] ہے۔

نبی رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا — ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ ایک ایک عورت جہنم میں جاتے ہوئے چار چار مردوں کو ساتھ لے جائے گی اگرچہ وہ باقی امور میں دوزخ سے بری ہوں لیکن جب باپ سے سوال ہوگا کہ یہ بیٹی تیرے گھر جوان ہوئی۔ تو نے اسے امورِ خانہ داری سکھائے دنیا کی رسومات سکھائیں دنیا کی تعلیمات دیں اسے سکولوں میں پڑھایا۔ کیا تو نے اسے دینی تعلیم بھی دی۔ اب جبکہ یہ دین سے محروم ہونے کی وجہ سے یہ جہنم جا رہی ہے۔

جانتی ہی نہیں تو یہ عمل کیا کرتی تو نے اس کے لیے کیا کیا اگر کچھ نہیں کیا تھا تو تجھے اس کے ساتھ جانا ہوگا کہ تیری غفلت کی وجہ سے اگر اسے جہنم کی سزا بھگتنا پڑتی ہے تو ساتھ تجھے بھی بھگتنا پڑے گی۔ باپ کے بعد بھائی کی باری ہوگی کہ تیرے ساتھ پلی بڑھی جوان ہوئی جو کچھ تو نے سیکھا دین کے متعلق تم نے اسے سکھایا اگر نہیں تو تمہیں بھی اس کے ساتھ جہنم جانا۔ پھر خاوند سے پوچھا جائے گا کہ ان کے بعد یہ تیرے ساتھ زندگی گزارتی رہی تو نے اس کی آخرت کا فکر کیا۔ تو نے دین کی تعلیم اور قرآن و سنت کے متعلق کچھ بتانے کی کوشش کی۔ اگر تو نے بھی پرواہ نہیں کی تو تجھے بھی اس کے ساتھ جہنم جانا ہوگا۔ پھر بیٹے کی باری آئے گی کہ تجھے اس نے اپنا خونِ جگر دے کر پالا تھا۔ تو نوجوان تھا یہ بوڑھی تھی۔ کبھی تو نے فکر کیا کہ یہ میری ماں ہے۔ اس نے کتنی شفقتیں کتنی محبتیں کتنا پیار دیا ہے مجھ کو۔ اب جبکہ یہ آخرت کو جا رہی ہے یہ وہاں جا کر کیا کرے گی۔ میں اسے کچھ مسائل ضروریات دین کے بارے میں بتا دوں۔ فرض و سنت و واجب ہی بتا دوں پاک پلید حرام حلال کے بارے میں بتا دوں کہ جب تک کوئی جانتا نہیں وہ عمل کیسے کرے گا۔ اگر تو نے بھی پرواہ نہیں کی تو تجھے بھی ساتھ جانا ہوگا۔ ایک خاتون چار چار مردوں کو اپنے ساتھ اس ذمہ داری کی وجہ سے لے جائے گی کہ انہوں نے اس کی تربیت کی طرف توجہ نہیں دی۔

تو حضرات یہ نہایت اہم پہلو ہے اس کی طرف بالکل ہی توجہ نہیں دی جا رہی خاص کر آپ جو کچھ یہاں سیکھتے ہیں وہ گھر جا کر ضرور سکھائیں والدہ کو بہن کو بیوی کو اور بیٹی کو جو کچھ آپ جانتے ہیں کوشش کریں کہ وہ معلومات یا وہ ذخیرۂ علم ان تک بھی پہنچے اور مردوں کے علاوہ خواتین بھی معاشرے میں ایک مثبت کردار ادا کریں۔ اتنا علم و عمل اللہ نصیب فرمائے کہ وہ دوسری عورتوں کو سمجھا سکیں۔ برائی سے منع کریں نیکی کا حکم کریں اور خود ذاتی طور پر اللہ کی عبادت کریں۔ عبادت تب ہی کر سکیں گی جب وہ اس سے واقف ہوں گی اس کے طریقوں سے اس قاعدوں اور ضابطوں سے اس کے اوقات سے۔

وَلْيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ — جس طرح مرد مال کا مالک ہوتا ہے اسی طرح خواتین بھی مال کی مالک ہیں۔ ایک گھر میں رہتے ہوئے

خواتین کو حق حاصل ہے کہ وہ بھی اپنا کاروبار کریں۔ کسی ذریعے سے کسی طریقے سے اپنا سرمایہ کام میں لگائیں اور اپنے لیے دنیا کی دولت کما سکتی ہیں جائز وسائل سے۔ یہ جو ہم نے انہیں جزوِ معطل بنا کر رکھ دیا ہے نا کہ عورت کا اس میں کیا کام یہ درست نہیں ہے۔ خود زمانہ نبوی میں علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور آپؐ سے پہلے تھیں بعثت کے زمانے میں خواتین کاروبار کرتی تھیں بلکہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مال تجارت لے کر ہی حضورؐ تشریف لے گئے تھے۔ بعثتِ نبوت کے بعد عورتوں کو کاروبار سے منع نہیں کر دیا گیا بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ جو حق مہر کی رقم رکھی گئی ہے نکاح کے بدلے شاید اسی گھر میں آنے والی نئی خاتون کی ذاتی ملکیت کی ابتدا کرنے کے لیے نئے گھر میں جب کوئی خاتون آتی ہے تو اس گھر کی اصل ملکیت تو مرد کی ہوتی ہے۔ وہ مرد کے واسطے سے اس کی بیوی ہونے کے ناطے سے ان چیزوں پہ متصرف ہوتی ہے اگر تو مرد اسے گھر سے نکال دیتا ہے تو گھر پر مکان پر اور سرمایہ پر اس کا کوئی اختیار نہیں ہوتا وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے چلی جاتی ہے۔ تو ایک نئے فیملی یونٹ میں جب ایک نئی خاتون باہر سے داخل ہوتی ہے تو رب کریم نے پہلا قدم یہ رکھا ہے کہ جب اس کے آنے کا سبب بنے یعنی جب نکاح ہو رہا ہو ابھی گھر میں پہنچی نہیں ہے تو اسے کچھ رقم ایسی دے دی جائے جس سے اس کی ذاتی ملکیت کی ابتدا ہو کہ مہر کی رقم کلی طور پر عورت کی ملکیت ہوتی ہے۔ وہ خاوند کو اس میں سے کچھ دے دے تو یہ اس کی عطا ہے بخشش ہے اگر نہ دے تو اس پر کسی کو اختیار نہیں ہے کہ خفا ہو یا ناراض ہو۔ وہ اسے کسی کاروبار میں لگائے وہ اس سے کوئی کام کرے۔ وہ اس سے کوئی چیزیں منگوا لیتی ہے یا کشیدہ کاری کرتی ہے یا کچھ کام کرتی ہے اور بیچ دیتی ہے اور سرمایہ بڑھاتی ہے۔ اس کا اسے حق حاصل ہے۔ اس کے پاس سرمایہ ہوگا تو وہ زکوٰۃ دے گی۔

قرآن حکیم فرماتا ہے یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ دونوں ہی عبادت کرتے ہیں وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ دونوں ہی زکوٰۃ دیتے ہیں — تو دونوں کے زکوٰۃ دینے سے مراد یہی ہوگا کہ عورت کو بھی اتنا ہی حق ملکیت حاصل ہے جتنا مرد کو ہے۔

ہمارے معاشرے کی دوسری کمزوری یہ ہے کہ ہم نے تمام طرح کی ملکیت مرد کے لیے تو تسلیم کر لی ہے۔ خواتین کو بیٹیوں کو یکسر محروم کر دیا۔ حتیٰ کہ اسلام اسلام کرنے والوں کو جب صرف اپنی

وراثت میں اسلامی طریقے سے جائیداد تقسیم کرنے کو کہا گیا تو بڑے سے بڑے لوگ بھی جو ہیں وہ بیٹیوں کو پکڑ کر لے جاتے ہیں اور اُن سے جائیداد اپنے نام منتقل کروالیتے ہیں۔ بھائی بہنوں کو لے جاتے ہیں۔ مَیں نے آج تک نہیں دیکھا کہ کسی باپ نے کسی بھائی نے خوش دلی سے اپنی جائیداد بیٹیوں اور بیٹوں پر تقسیم کی ہو۔ اگر کسی نے کوئی لے لیا ہے تو لڑ بھڑ کر عدالت میں جاکر ساری شرم و حیا کو چھوڑ کر حالانکہ اُس کا حق بنتا تھا لیکن اسے تمام شرم و حیا سارا لحاظ چھوڑنا پڑا۔ عدالتوں کے دھکے کھانے پڑے تب جاکر اسے کوئی چیز ملی اور پھر بھی آخری حیلے کے طور پر یہ کہتے ہیں کہ یہ زمین تمہارے حصے میں آتی ہے اس کی قیمت لے لو۔ یہ پھر بھی دینے کو جی نہیں چاہتا حالانکہ حق یہ ہے کہ بیٹی یا بیوی یا بہن اگر یہ کہے کہ مَیں لینا نہیں چاہتی تو بیٹا یا دوسرے ورثاء اگر یہ کہہ دیں کہ اگر تم نہیں لینا چاہتیں تو ہم بھی نہیں لینا چاہتے جو حق ربّ جلیل نے ہمیں دیا ہے وہ ہمارے لیے کافی ہے ــــ تاکہ اس رسم بد کی حوصلہ شکنی ہو۔ لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ ایک بچی کو حق مہر کے طور پر چند سکّے دے دیئے اور یہ بڑی عجیب بات ہے یہاں بڑی پابندی کرتے ہیں دین کی کہ جناب حضورؐ کے زمانے میں جو مہر دیا جاتا تھا وہ آج کے زمانے کے لحاظ سے ساڑھے بتیس روپے بنتا ہے یہ ساڑھے بتیس روپے دے دو۔ یہاں تو لوگوں کو سنّت یاد آتی ہے یہ نہیں سمجھتے کہ اُس دَور کے بتیس روپوں کو اگر قیمت کے اعتبار سے کریں گے تو شاید آپ کے دَور کے بتیس لاکھ بن جائیں گے۔ آپ کے روپے کی قیمت میں زمانۂ نبی اطہر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے آج تک جو اتار چڑھاؤ ہوا ہے اگر ہم اُس زمانے کے بتیس روپوں کو اینالائز کریں گے یا تجزیہ کریں گے تو میرے خیال میں آج کے بتیس لاکھ بن جائیں گے۔ اگر سنّت کی اتباع کا شوق ہے تو پھر اسی طرح سے کرو کہ اُس وقت روپے کی قیمت کیا تھی۔ روپے کی جنس کتنی ملتی تھی روپے کے مویشی کتنے ملتے تھے روپے کا پھل کتنا ملتا تھا۔ سونا ایک بنیادی فیگر ہے پوری دنیا میں۔ اُس وقت بتیس روپے کا کتنا سونا ملتا تھا۔ اب اتنا سونا دے دو۔ بڑا سادہ سا اصول ہے۔ اُس وقت بتیس روپے میں شاید بتیس تولے سونا آجاتا ہوگا۔

لیکن یہاں ہماری سنّت کو سمجھنے کی استعداد

جو ہے بدل جاتی ہے بتیس کے بتیس روپے آج کے دے دیتے ہیں اور یہ زیادتی ہے دین داری نہیں ہے جو احباب جو لوگ جو دوست یہ کرتے ہیں ظلم کرتے ہیں۔ میرے اپنے خیال میں نکاح اگرچہ ایک کھجور کے دانے پہ منعقد ہو جاتا ہے۔ اگر وہ بطور معاوضہ قبول کر لے تو۔ لیکن مناسب یہ ہے کہ جسے آپ رشتہ دے رہے ہیں کم از کم اس کے ایک مہینے کی آمدنی جو ہے وہ تو اس کو دلوا دی جائے۔ اگر ایک آدمی پانچ ہزار روپے ماہوار کا ملازم ہے تو اسے کیا مصیبت ہے کہ وہ پانچ ہزار مہر نہیں دے سکتا۔ ایک آدمی پانچ سو پر ملازم ہے تو اس کے لیے مشکل نہیں ہے کہ وہ پانچ سو روپے حق مہر کے دے دے۔ یہ میری اپنی ذاتی رائے ہے کوئی شرعی قاعدہ نہیں ہے۔ لیکن اس سارے کا تجزیہ کرنے کے بعد۔ میں نے پچھلے دنوں ایک رکوع لکھا ہے اسرار التنزیل کا جس میں مہر کی بحث آتی ہے تو میں نے اپنی لائبریری میں جتنی تفاسیر مجھے مل سکیں میں نے سب کو تلاش کیا۔ حدیثوں کی کتابوں میں تلاش کیا۔ فقہ کی کتابوں میں تلاش کیا۔ جب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عورت کو مہر کیوں دیا جاتا ہے تو کہیں بھی مجھے اس کا جواب نہیں ملا۔ شاید اس لیے علمائے متقدمین نے اور سلف صالحین نے اس کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی اور بعد والوں نے اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ چونکہ اُس زمانے میں یہ بات واضح تھی کہ عورتیں اپنا کاروبار کرتی تھیں۔ شراکت کا حکم دے دیتی تھیں۔ تاجروں کو اور مویشی پال لیتی تھیں اپنے غلام خرید لیتی تھیں جو ان کے ریوڑ چراتے تھے تو اُس زمانے میں تو یہ بات واضح تھی کہ یہ عورت کی ذاتی ملکیت کے لیے ہے۔ جب یہ نئے گھر میں آتی ہے تو اسے اپنی ملکیت کی ابتدا کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ بنیاد فراہم کی جائے سرمایہ دیا جائے۔

جو اتنی عام بات تھی کہ عملی زندگی میں قبل بعثت بھی عربوں کی زندگی میں یہ بات موجود تھی کہ شاید انہوں نے اسے لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور جب زمانہ گزرا تو بعد والوں نے صرف یہ لکھ دیا کہ اللہ کا انعام ہے۔ عورت کے لیے اللہ کا انعام تو ہے مگر کوئی مقصد کوئی مصرف کوئی بات بھی ہوگی۔

ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ یا تو مہر لکھ دیا جاتا ہے دو لاکھ تین لاکھ چار لاکھ لیا نہیں جاتا وہ پروٹیکشن یا حفاظت ہوتی ہے طلاق سے

بچنے کے لیے ایک آڑ بنائی جاتی ہے کہ اگر یہ کبھی موقع آئے خاوند اسے طلاق دینا چاہے تو اسے تین لاکھ یا پانچ لاکھ کا ہوّا سامنے نظر آئے کہ اگر طلاق دوں گا تو اتنے پیسے بھی تو دینے پڑیں گے۔

یعنی وہ جو مقصد ہے حق مہر کا وہ نہیں ہوتا ان کے سامنے۔ مقصد تو یہ تھا کہ عورت کو وہ رقم دے دی جاتی ہے اور اس میں شریعت نے آسان کر دی نقد رقم دے دو۔ اگر اس وقت موجود نہیں ہے تو موجل ایک اصطلاح ہے فقہ کی کہ عورت جب بھی مانگے اسے دے دو۔ آج ہی مانگ لے کل مانگ لے۔ پرسوں مانگ لے سال بعد مانگ لے یا دس سال بعد مانگ لے تو اسے دے دو۔ اس کی آڑ لے کر لوگ نقد دیتے ہی نہیں ہیں وہ جو بتیس روپے ہیں نصف کر دو سولہ دے دو اور وہ سولہ بھی جو ہوتے ہیں وہ اس خاوند کے گھر پہنچنے پر جب وہ گھر پہنچتی ہے تو کچھ مہر کی رقم اس کے پاس ہوتی ہے۔ کچھ رشتہ دار سہیلیاں دو دو چار چار دس دس روپے اسے دیتی ہیں جس پر سسرال والوں کی نظر ہوتی ہے۔ وہ ایک ایک پائی گنتے رہتے ہیں کاپی میں لکھا جاتا ہے اور جب سمجھتے ہیں کہ آمدن ختم ہو گئی تو کہتے ہیں بیٹی رقم ہمیں دے دو۔ فلاں دعوت کی ہے تھی۔ وہ خرچ دینا ہے۔ فلاں غلہ کا خرچ دینا ہے کیوں غلہ خریدتے ہو جب تمہارے پاس پیسے نہیں۔ کیوں دعوت دیتے ہو جب تمہارے پاس پیسے نہیں۔ کیوں ادھار زیور خریدتے ہو جب تمہارے پاس پیسے نہیں ـــ اگر تُو نے خریدا ہے تو تم نے اپنی انا کے لیے خریدا ہے۔ تم کماؤ اور مزدوری کرو۔ تم دوسروں سے کیوں چھینتے ہو۔

لیکن ہوتا یہ ہے کہ اسّی نوّے سو سال کی ضعیفہ عورت لاٹھی ٹیکتی ٹیکتی قبرستان جا رہی ہوتی ہے ـــ بڑھیا بے چاری اس فکر میں ہوتی ہے کہ اس نے مجھے آج تک دوّنی دی تو نہیں چلو میں ہی اسے معاف کر دوں۔ اگر معاف ہی ہو جائے تو جو مقصد شریعت مطہرہ نے رکھا ہے وہ تو فوت ہو گیا ـــ تو یہ تیسری کمزوری ہے ہماری جس کی وجہ سے پورے اسلامی معاشرے کو نقصان ہو رہا ہے اور اس کو لوگوں نے اس سے کہیں آگے بدل لیا ہے والدین جو ہیں وہ لڑکی کے نکاح کے بدلے رقم وصول کر لیتے ہیں۔ دس ہزار بیس ہزار پچاس ہزار ایک لاکھ ـــ اور یہ سب عزیزوں میں ہم

سے کہیں زیادہ ہے۔

یہ مڈل ایسٹ کی سٹیٹس جو ہیں یہ ہم سے بہت آگے نکلی ہوئی ہیں اور یہ اسے معاہدہ پر سٹیج باوقار سمجھتی ہیں کہ فلاں کی بیٹی کے کتنے پیسے دیئے گئے ہیں اسے وہ معیار سمجھتے ہیں اپنی عزت کا۔ کہ تُو نے بیٹی دی تھی تجھے بتیس ہزار ملا تھا اور میری بیٹی کے لوگوں نے ڈیڑھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ دیا تھا وہ اسے اپنا معیار سمجھتے ہیں۔

یعنی کہاں سے بات چلی تھی اور مسلمان کو کچھ نہیں ہُوا۔ بات کہاں تک پہنچی ——— مسلمان کا عجب حال ہے اس کی مسلمانی مجروح نہیں ہوتی۔ یہ ٹوٹتی پھوٹتی نہیں خواہ یہ کفر ہی کرتا رہے۔ عورت کو حق حاصل ہے کہ اس کی ذاتی ملکیت ہو جس میں مرد کی مداخلت نہ ہو۔ اگر وہ رکھے تو اسے حق حاصل ہے کہ رکھے اگر اسے والدین کی طرف سے وراثت ملتی ہے زمین کی صورت میں مکان کی صورت میں یہ اس کا حق ہے وہ چاہے تو نیچے چاہے تو رکھے اپنے بیٹوں کو دے اپنی بیٹیوں کو دے، اپنے وارثوں کو دے کر مرجائے اُسے مجبور کرنا۔ جیلے حوالوں سے اُسے انگوٹھے لگانا شرعاً حرام ہے درست نہیں ہے۔

ایک یہ صورت کہ حق مہر دیا ہی برلے نام جاتا ہے اور جو دیا جاتا ہے وہ لے لیا جاتا ہے یہ مستحسن بات نہیں ہے۔ مجبور کی رضامندی کو رضامندی کہنا یہ زیادتی اور ناانصافی ہے لیکن وہ سمجھتی ہے کہ میں ان کے ہاتھوں میں ایسی ہوں جیسے قصاب کے ہاتھ میں سرغا ہوتا ہے۔ اگر میں نہیں دوں گی تو میرا گھر اُجڑ جائے گا۔ یہ مجھے یہاں سے بھگا دیں گے ——— یہ کہاں کی رضامندی ہے۔ یہ تو ڈاکہ ہے۔ جس طرح ڈاکو کسی کے سینے پہ بندوق تان کر کہتا ہے کہ رقم رکھ دو یہ تو وہی ڈاکہ ہے شکل مختلف ہے کہ ایک عورت کی ایک بی بی کی زندگی داؤ پر لگی ہے سارا مستقبل داؤ پر لگا ہے کہ وہ دو ہزار چار ہزار دیتی ہے۔ نہیں دیتی تو ساری زندگی کے لیے بھگا دی جاتی ہے۔ یہ رضامندی سے لینا تو نہ ہُوا۔ یہ تو سیدھا سادھا ڈاکا ہے۔ جس کا پتہ میدانِ حشر میں جا کر چلے گا۔ جسے ہم رضامندی سمجھے تھے وہ تو ہمارا جبر تھا۔ کیونکہ وہاں تو انصاف ہو گا۔ کھری کھری بات ہو گی۔ ہیرا پھیری نہیں مانی جائے گی اور وہ جسے لیم ایکسکیوز کہتے ہیں کہ بے جان بہانے۔ جن کے پیچھے کوئی جواز نہیں ہوتا وہ وہاں نہیں چل سکیں گے وہی وہاں قبول ہو گا جس کی

شرعی حیثیت ہوگی۔

تو بہرحال تعلیم میں عبادات میں اور معاملات میں مرد اور عورت تینوں برابر کے مستحق ہیں۔

وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ۔

اور اپنے ان سارے معاملات میں تعلیمات ہوں عبادات ہوں یا معاملات مرد بھی اور خواتین بھی اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کے لیے کوشاں رہیں گے۔ أُولَٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ ۗ یہ ہیں وہ لوگ جو اللہ کی رحمت کے حقیقی امیدوار ہیں۔ انشاء اللہ ایسے لوگوں پر اللہ اپنی رحمت نچھاور کرے گا۔

بحیثیت انسان اگر ان سے بھول چوک ہوگئی غلطی ہوگئی کوتاہی ہوگئی تو اللہ فرماتا ہے میری رحمت کا دامن وسیع ہے۔ میں انہیں اپنے دامانِ رحمت میں پناہ دوں گا۔ ان کی خطائیں معاف کر دوں گا۔ ان کی ٹوٹی پھوٹی نیکیاں قبول کر لوں گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ہیرا پھیری نہ کی جائے سیدھا سیدھا معاملہ کیا جائے۔

إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ

اللہ غالب بھی ہے اور دانا بھی ہے

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

ف ہ

سعادتِ عمرہ اور تبلیغی پروگرام

۱۔	جمعرات	۷-۱-۸۸	روانگی از اسلام آباد برائے جدہ
۲۔	جمعۃ المبارک	۸-۱-۸۸	جدہ سے مکہ مکرمہ
۳۔	منگل	۱۲-۱-۸۸	روانگی از مکہ مکرمہ برائے مدینہ منورہ
۴۔	سوموار	۱۸-۱-۸۸	روانگی از مدینہ منورہ برائے جدہ
۵۔	جمعرات	۲۱-۱-۸۸	روانگی از جدہ برائے نیروبی
۶۔	اتوار	۲۴-۱-۸۸	روانگی از نیروبی برائے ابوظہبی
۷۔	منگل	۲-۲-۸۸	روانگی از دوبئی برائے کراچی
۸۔	بدھ	۳-۲-۸۸	روانگی از کراچی برائے اسلام آباد اور اسلام آباد سے مانسہرہ

اسلام۔ جہدِ مسلسل، حیاتِ نو اور عہد آفریں انقلابی زندگی کا ابدی پیغام ہے

خطاب حضرت المکرم

برموقع اجتماع لنگر مخدوم

۱۴ر اکتوبر ۱۹۸۷ء

خطبہ مسنونہ کے بعد سورۃ والعصر کی تلاوت فرمائی اور ارشاد ہوا:

"بنیادی طور پر ہم ایک سلسلہ تصوف سے منسلک ہیں۔ ہماری تقریر کا موضوع بھی اکثر اسی محور کے گرد گھومتا ہے۔ بات ذکرِ الٰہی کے متعلق چلتی رہتی ہے اور تحریریں بھی عموماً اسی موضوع پر ہوتی ہیں اور یہ قدرتی بات ہے کہ جو شخص جس پہلو سے کام کر رہا ہو وہ اس پہلو سے گفتگو کرنا پسند کرتا ہے۔ یا اس کا رجحان طبعی اس طرف ہو جاتا ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم زندگی کے باقی امور سے کسی طرح کوئی فرار کا راستہ تلاش کرتے ہیں یا دوسروں کو دکھاتے ہیں۔ بلکہ یہ اللہ جل شانہٗ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس حلقۂ ذکر نے اور اس سلسلۂ عالیہ نے اس زمانے میں تصوف کی حقیقی تصویر پیش فرمائی ہے۔ ورنہ لوگوں سے اس کی تعبیر خلط ملط ہو چکی تھی اور یہ سمجھا جا رہا ہے کہ شاید اللہ اللہ کرنے والے لوگ دنیوی اعتبار سے

میدانِ عمل میں ناکارہ قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ جو خلائق سے آنکھیں بند کرکے کسی گوشے میں بیٹھ کر کسی خانقاہ میں بیٹھ کر، کسی مسجد میں بیٹھ کر اپنا وقت گزار دیتے ہیں۔ خود رشتۂ حیات کو استوار رکھنے کے لیے اپنی روزی تک پیدا کرنے کی استعداد نہیں رکھتے۔ چنانچہ عملی زندگی سے بیگانہ ہو کر عمرِ عزیز کو بجائے صرف کرنے کے ضائع کر دیتے ہیں ــــ ایسی کوئی بات نہیں ہے بلکہ حقیقی تصوف وہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے خدام کو سکھایا۔ اپنے شاگردوں کو سکھایا۔ ان لوگوں کو پہنچایا، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ عالی میں پہنچے۔

صحابہ کرامؓ قرآنِ حکیم کے مثالی مسلمان ہیں۔ قرآن کریم نے جہاں ایمان کی مثال دینا چاہی۔ وہاں ان کے ایمان کو مثالی اور معیاری قرار دیا "فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَا اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا " کہ جسے ماننا ہو جسے ایمان لانا ہو وہ اس طرح سے ایمان لائے جس طرح سے یہ لوگ ایمان لائے ہیں ــــ تو وہ ہدایت یافتہ ہے۔ اور اگر اس کے ایمان کا معیار یہ نہ ہو ــــ " فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ " تو وہ بدبختی اور گمراہی کا شکار ہے ــــ اسی طرح جب دیانت وامانت کی بات آتی ہے۔ جو خالصتاً انسان کی ایک قلبی اور اندرونی صفت ہے۔

آپ کسی کے چہرے سے نہیں پڑھ سکتے کہ یہ شخص امین ہے یا خائن ہے۔ اس کے اندر کیا کچھ بھرا ہے۔ اس پہلو پہ بھی ربِ کریم نے ارشاد فرمایا: " اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى " یہ ایسے لوگ ہیں کہ تقویٰ و پارسائی کے لیے نیکی اور بھلائی کے لیے ان کے قلوب کو آزما لیا گیا ہے ــــ " اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۔ " یہ بڑے کھرے، بڑے سچے، بڑے پکے، بڑے خالص ایماندار ہیں ــــ اسی طرح تمام محاسن میں، تمام امورِ الٰہی میں کی تعمیل میں، حتیٰ کہ انہیں معیارِ حق قرار دیتے ہوئے پورے عالمِ اسلام کو تین حصوں میں بانٹ دیا۔ ربِ جلیل نے ــــ دو حصے صحابہ، مہاجرین وانصار" وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ" اور تیسرا حصہ ہر وہ شخص جو ان کی غلامی اختیار کرلے۔ اس سے بعد اسلام کا کوئی تصور

نہیں۔ "وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ" یعنی قرآنِ حکیم کی زبان میں مہاجر و انصار کے بعد، ان دو طبقوں کے بعد تیسرا طبقہ مسلمانوں کا وہ ہے جو خلوصِ قلب کے ساتھ ان کی اطاعت اختیار کرلے۔ اس سے باہر مسلمان ہونے کا کوئی تصور نہیں۔

یہ جو مثالی مسلمان ہیں اللہ کریم کے، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے، یہی بنیاد ہیں سارے دین کی ــــ آپ ان کی مبارک زندگیوں کا مطالعہ کریں تو ایک بات جو بطور قدرِ مشترک سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے وہ انقلابی کام کیے جو عام حالات میں انسان کے بس کی بات نظر نہیں آتی۔ مثلاً آپ ایک ہی بات دیکھ لیں کہ صحرائے عرب یا جزیرۃ العرب کے رہنے والے، خانہ بدوش قبائل اُس دور میں جب انفرادی قوت ہی سرمایہ ہوتی تھی، آج تو ایٹمی دور ہے۔ ایک آدمی بھی بیٹھا ہوا لاکھوں کو تباہ کرسکتا ہے۔ لیکن اُس وقت انفرادی قوت ہی اصل ہوتی تھی ــــ دست بدست جنگیں ہوتی تھیں ــــ تو ان میں وہ جذبہ۔ وہ قوتِ کار، وہ استعداد وہ قابلیت، وہ جرأت، وہ نظم و ضبط، وہ سب کچھ آجائے کہ وہ ربع صدی میں روئے زمین کی بڑی بڑی سلطنتوں کو پامال کرکے وہاں عدل و انصاف قائم کردیں اور کفر کو مٹا کر، کفر کی ظلمت کو مٹا کر، ظلم اور جور کو مٹا کر وہاں عدل و انصاف قائم کریں اور وہاں اللہ کا نام روشن کردیں۔ یہ کتنی عجیب بات ہے۔

ایک ہم ہیں کہ ہمارے گرد و پیش، ہم اسلامی ملک میں رہتے ہیں۔ ہمارے گرد و پیش صدیوں سے مسلمان لوگ جو نسل در نسل مسلمان آرہے ہیں وہ ہمارے ساتھ بستے ہیں۔ ہمارے وجود میں اتنا اثر بھی نہیں ہے کہ جو لوگ پہلے سے مسلمان ہیں، ان کی اصلاح ہی ہوجائے۔ یہ دعویٰ ہمارا بھی وہی ہے۔ ہم بھی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے تعلق کے مدعی ہیں، اپنے ایمان کے مدعی ہیں۔ اپنے علم اور اپنے دانش اور اپنے بیانات اور اپنی تحریروں پر ہمیں ناز ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا ہے۔ آج اگر ان کی مقدس زندگیوں کو دیکھیں تو یہ بات انسانی عقل سے بہت بالا تر ہے کہ اس دور میں صحرائے عرب سے لوگ اُٹھ کر قیصر و کسریٰ کو شکست سے دوچار کریں۔

یہ کسریٰ کی سلطنت جو ہے، تاریخ میں طوفانِ نوح علیہ السلام کے بعد پہلی سلطنت ہے جو روئے زمین پر وجود پذیر ہوئی۔ اور جب سے لے کر عہدِ صحابہ رضؓ تک یہ ایک خاندان میں چلتی رہی۔ ایک نسل میں نہ سہی۔ یعنی ہر باپ کا بیٹا اگر حکمران نہیں ہوا تو اس کا بھائی ہوگیا۔ بھتیجا ہوگیا۔ ایک ہی خاندان میں چلتی رہی۔ صدیوں چلتی رہی ـــــ یہ آگ کو پوجا کرتے تھے ـــــ اور اللہ کی مخلوق بھی رنگا رنگ ہے۔ ایک کیڑا ہوتا ہے جسے سمندر کہتے ہیں اور اللہ کی شان وہ وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں مسلسل ایک ہزار برس آگ جلتی رہے۔ اور بجھنے نہ پائے۔ تو اس میں وہ کیڑے پیدا ہوجاتے ہیں۔ دنیا میں آتش کدہ ایران میں ان کا وجود پایا گیا۔ باقی کہیں نہیں ملتے کوئی آتش فشاں بھی ایسا نہیں جو ہزار برس مسلسل دہکتا رہا ہو ـــــ تو یہ ہزاروں سالوں کا اختیار کردہ مذہب چھڑا دینا کوئی آسان کام تھا۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ تسخیرِ ممالک بہت مشکل ہوتی ہے۔ جو لوگ اس پیشے سے منسلک ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی بھی دوسری سلطنت سے ایک اینچ زمین لینا، یا ایک چوکی پر قبضہ کرنا، یا دس قدم آگے بڑھنا کیا معنی رکھتا ہے۔ لیکن اس سے بھی مشکل تر کام یہ ہوتا ہے کہ صدیوں سے کوئی رسم آرہی ہو بطور عقیدہ کے آرہی ہو۔ بطور مذہبی تقدس کے آرہی ہو اور ان لوگوں سے یہ چھڑا دی جائے یہ انتہائی مشکل کام ہے ـــــ دیکھا قوموں کی قومیں تہ تیغ ہوجاتی ہیں۔ قتل ہوجاتی ہیں لوگ تباہ ہونا گوارا کرتے ہیں۔ لیکن مذہب نہیں چھوڑتے۔

یہاں ہمارے آپ کے ساتھ ہندو سکھ بستے تھے۔ مارے بھی گئے۔ قتل بھی ہوئے۔ گھر بھی اُجڑے دولت بھی چھوڑی۔ علاقہ چھوڑا اور ملک چھوڑا۔ لیکن کسی نے کلمہ پڑھنا گوارا نہیں کیا۔ مذہب تو ان کا بھی باطل تھا۔ لیکن کیا انہوں نے اس باطل کو چھوڑ دیا۔ نہیں چھوڑا ـــــ

صحابہ کرام رضؓ کی برکات میں ایک عجیب بات ہے کہ جس جس سرزمین پر ان کے پاؤں لگے ہیں اور جو جو ملک انہوں نے فتح کیا ہے چودہ صدیاں گزر گئی ہیں وہاں سے اسلام کو نہیں مٹایا جا سکا۔ یہ آج بھی کراماتِ صحابہ میں سے ایک بہت بڑی کرامت روئے زمین پر موجود ہے۔ عملی شکل میں کہ وہ سلطنت بٹ گئی

اس کی کئی سلطنتیں بن گئیں۔ ان میں کئی انقلاب آئے۔ اس پر کافر بھی حکمران رہے۔ لیکن یہ نہیں ہو سکا کہ اس زمین پر سے اذان اور کلمے کی آواز مٹا دی جائے۔ آج بھی آپ دیکھتے ہیں چین سے ہسپانیہ تک اور سائبیریا سے جنوبی افریقہ تک جتنی کوشش میرے خیال میں روس نے کی ہے اسلام کو مٹانے کی اور مذہب کا نام ہی مٹانے کی۔ نہ صرف اسلام بلکہ دنیا کا کوئی مذہب نہ رہے۔ اتنی شاید تاریخ میں کبھی نہ کی گئی ہو۔ آدمی ان مظالم کا تصور نہیں کر سکتا جو اس سرخ ابلیس نے عالم انسانیت پر اور بالخصوص مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے گئے ہیں۔ تاشقند و بخارا پر جب قبضہ ہوا تھا روس کا، تو یہ حشر کیا گیا تھا کہ علمی خانوادوں کو علیحدہ کر لیا گیا۔ خصوصاً علماء کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا کہ ان کی جوان بچیوں کو بیگار کیمپ کے لیے مخصوص کیا گیا اور علماء کو مجبور کیا گیا کہ وہ گڑھے کھودیں اور انہی گڑھوں میں، ان کے گھٹنوں میں، ان کی کہنیوں میں اور جوڑوں میں، جہاں اعضاء کے جوڑ ہوتے ہیں گولی مار دیتے تھے۔ اور پھر چونا چھڑک دیتے تھے دو دو، تین تین دن وہ چونا ان کے گوشت کو کھاتا رہتا تھا۔ اور وہ تڑپتے سسکتے جان دیتے تھے۔ اور ان کی جوان بچیوں سے سڑکیں بنواتے تھے اور ان سے بیگار لیتے تھے اور رات کو وہ سپاہیوں کے کیمپوں میں ہوتی تھیں۔ جن لوگوں کو سرخ انقلاب کا انتظار ہے، سمرقند و بخارا کی تاریخ ہی دیکھ لینی چاہیئے۔ لیکن اس کے باوجود جہاں تک صحابہ رضؓ کے نقوش مٹا نہیں سکا۔ آج بھی وہاں لوگ سجدے دیتے ہیں۔ نماز پڑھتے ہیں۔ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں اتنے جبر و تشدد کے باوجود مساجد ویران ہو گئیں آج بھی سمرقند و بخارا کی مساجد میں کلب بنے ہوئے ہیں۔ ہمارے سامنے یہ تاریخ موجود ہے کہ نہ افرادی قوت ہے عربوں کے پاس، نہ وسائل اور ذرائع ہیں۔ اس کے باوجود اس زمانے میں جب سب سے سبک رفتار سواری گھوڑا ہوتا تھا۔ کہاں صحرائے عرب سے اٹھتے ہیں اور کہاں چین اور کہاں سائبیریا۔ وہاں تک ان کی اذانیں پہنچتی ہیں اور ان کے قدم پہنچتے ہیں۔ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اللہ کی مخلوق کو انقلاب آشنا کرتے چلے جاتے ہیں۔

اس کے پیچھے کیا بات تھی۔ کیا یہ عرب

اسی وقت پیدا ہوئے۔ یا اس سے پہلے دنیائے عرب میں آباد تھی۔ آبادی تو تھی۔ صدیوں سے تھی۔ بڑے بڑے شہسوار پیدا ہوئے اور وہی ریت ان کو کھا گئی اور اب ان کا کوئی نام نہیں جانتا۔ بڑے بڑے دلیر، بڑے بڑے جرأت مند پیدا ہوئے۔ یہ انقلاب تھا لایا ہوا۔ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا۔ کہ جس نے ان عربوں میں وہ جرأت، وہ قوت، وہ روح اور وہ برکت اور وہ کمال پیدا کر دیا کہ انہوں نے روئے زمین کی تقدیر پلٹ کر رکھ دی۔ یہ آج بھی جو ان وسیع ممالک میں اذان کی آواز گونجتی ہے، یہ ان کے اخلاق کا نتیجہ ہے ورنہ دورِ حاضرہ کا مسلمان تو شاید اسے بھی قائم نہ رکھ سکے۔ تو سب سے پہلے صوفی بھی وہی تھے۔ جس طرح ان کا ایمان مثالی ہے جس طرح ان کا عمل مثالی ہے۔ جس طرح ان کا خلوص مثالی ہے۔ جس طرح ان کا ایثار مثالی ہے، اسی طرح تصوف کی زندہ مثال بھی وہی لوگ ہیں جنہوں نے براہِ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اکتسابِ فیض کیا۔ تو گویا یہ محفلِ ذکر، یہ توجہ، یہ اکتسابِ فیض، اس کا نتیجہ، ماحصل کیا ہونا چاہیئے کہ وہ شخص عملی زندگی میں جہاں پہلے دس میل چلنے کی جرأت رکھتا تھا وہاں بیس میل چلنے کی جرأت حاصل کرلے۔ اگر پہلے وہ چل سکتا تھا۔ لیکن اس کی سمت درست ہو جائے۔ اگر پہلے وہ مشقت کرتا تھا محض دنیا کے لیے تو پھر اس کی مشقت دنیا کے ساتھ دین کو مقدم رکھ لے۔ تصوف کا یہ ہرگز مقصد نہیں ہے کہ انسان عملی زندگی سے بیزار ہو کر گوشہ نشین ہو جائے۔ کسی کے ساتھ اس کا تعلق نہ رہے۔ کسی کے ساتھ اس کی بات نہ رہے۔ کسی میدان میں وہ کام کرنے کے اہل نہ رہے۔ یہ ہرگز نہیں ہے۔ یہ مقصد غیر اسلامی مذاہب میں ہے۔ یہ تصور غیر اسلامی ہے۔ بالخصوص ہندوستان کی قدیم قوموں میں اور ہمالیہ کی ترائیوں میں رہنے والے لوگوں میں اور جنوبی ممالک میں یہ تصور قدیم مذاہب سے چلا آرہا ہے۔ کہ کچھ لوگ عملی زندگی سے کٹ کر گوشہ نشین ہو جاتے۔ کچھ نہ کچھ چند کمالات وہ کسی نہ کسی پہلو سے جمع کر لیتے اور ان کے بل بوتے پر انہیں مذہبی تقدس حاصل ہوتا تھا۔ اسلام نے اس نظریہ حیات کی یک سر نفی کی ہے۔ آپ کے پاس امتِ مرحومہ میں مثالی انسان ہیں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ۔ ایک ایسا انسان کہ جس کا ثانی انبیاء کے بعد نہ ان سے پہلے کوئی گزرا ہے نہ ان کے بعد کوئی ہوا۔ قرآن حکیم میں اس بات کا

ثبوت موجود ہے۔ حضور نبی کریمؐ کے ارشادات میں اس بات کا ثبوت موجود ہے بلکہ آپؐ کا ارشاد گرامی موجود ہے کہ کسی شخص پر سورج طلوع نہیں ہوا کہ انبیاؑ کے بعد وہ ابوبکر صدیق رضؓ کے پائے کا آدمی ہو۔ لیکن ابوبکر صدیق رضؓ وہ پہلے سیاستدان ہیں کہ جس نے حضورؐ کے وصال کے بعد سلطنتِ اسلامی کو سنبھالا دیا۔ ابوبکر صدیق رضؓ وہ پہلا جرنیل ہے وصالِ نبویؐ کے بعد جس نے ڈٹ کر ہر باطل کا مقابلہ کیا۔ ابوبکر صدیق رضؓ وہ پہلا منتظم ہے کہ جس نے سلطنتِ اسلامیہ کو قانون دیا اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جاری و ساری فرمایا۔ ابوبکر صدیق رضؓ وہ پہلا بادشاہ ہے جس نے قیصر و کسریٰ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ اور وہ پہلا صوفی ہے کہ جس کے دل میں اتنی حرارت تھی کہ روئے زمین کے سارے انسانوں میں بانٹ دی جائے تو برداشت نہ کر سکیں۔

آپؓ کی سیرت میں ملتا ہے کہ جب سانس لیتے تھے تو جس طرح سے کباب بھونا جاتا ہے اس طرح کی خوشبو آتی تھی۔ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ ذکرِ الٰہی کا آئینہ دار ہوتا تھا لیکن عملی زندگی میں آپؓ نے وہ کام کیا جس کی مثال دنیا میں پیش نہیں کی جا سکتی حضورِ اکرمؐ کا وصال اتنا بڑا سانحہ تھا کہ جس نے فاروقِ اعظم رضؓ جیسے شخص کو ہلا کر رکھ دیا۔ جس نے فاروقِ اعظم رضؓ جیسے عظیم اور مضبوط اور ٹھوس انسان کا ہوش چھین لیا۔ یہ ابوبکر صدیق رضؓ کا حوصلہ تھا کہ جس نے اس وقت بھی پوری امت کو سنبھالا دیا۔ منکرینِ زکوٰۃ۔ مدعیانِ نبوت اور کذاب اور اس کے ساتھ سرحدوں پر قیصر کی افواج بڑے سے بڑے جری صحابہ رضؓ یہ عرض کرنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ یا صدیق رضؓ باری باری ان کی طرف رُخ کیا جائے۔ آپؓ نے فرمایا، اللہ کی قسم جب تک ابوبکر رضؓ کی جان میں جان ہے میں منکرینِ زکوٰۃ سے وہ رسی بھی وصول کروں گا جو جانور کے ساتھ عہدِ نبوی میں وہ دیتے تھے۔ اگر کوئی نہیں دے گا تو جہاد کروں گا۔ جھوٹے مدعیانِ نبوت کے ساتھ مقابلہ کروں گا۔ اور قیصر کی فوجوں کے مقابلے میں لشکر بھیجوں گا۔ بڑا عجیب جملہ آپؓ کا! فرماتے ہیں کہ جو کچھ حضورؐ نے عطا فرمایا ہے، اس میں سے کوئی ایک نقطہ کم نہیں کر سکے گا۔ کوئی ایک نقطہ بڑھا نہیں سکے گا جب تک ابوبکر صدیق زندہ ہے۔ یہ پتہ اُسے ہوتا ہے کہ جسے عشق سے پالا پڑا ہو۔ واقعی جس نے اس کا مزا چکھا ہو۔ اور پھر اس کا محبوب ہو،

ایسا مثالی محبوب جو اللہ کا بھی محبوب ہو اور اس کی محبت بھی مثالی ہو اپنے ہاتھوں سے اس رُخِ انور کو لحد میں اُتارے، جسے دیکھنا اس کی زندگی کا مقصد ہو۔ اور اس کے حواس اتنے قائم بھی رہیں کہ پوری سلطنت کا آسرا بن جائے۔ یہ کیا ہے اسی کا نام تصوف ہے۔

تصوف اس قوت کا نام ہے اس جذبے کا نام ہے جو مُردہ تنوں میں حیاتِ نو پیدا کردے جو بے عمل کو باعمل بنادے۔ جو نااہل کو اہلیت عطا کردے جو دلِ مردہ کو آتش فشاں کا دہانہ بناکر چھوڑے۔ تصوف کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ عملی زندگی چھوڑ کر انسان گوشہ نشین ہوجائے۔ یا میدانِ عمل سے فرار کا راستہ ڈھونڈے یا زندگی سے فرار کی راہیں تلاش کرے۔ یہ ہرگز مقصد نہیں ہے۔ ہر قابلِ قدر صوفی کا تذکرہ اور سوانح اگر آپ پڑھیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ انہوں نے دنیا میں ہر ہر لمحہ خلقِ خدا کی اصلاح کے لیے بسر کیا اور کتنے کتنے لمبے فاصلے طے کرکے کہاں کہاں تک اللہ کریم کا پیغام پہنچایا۔ آپ کسی بزرگ کی سوانح پڑھ لیں تو آپ دیکھیں گے کہ کن نامساعد اور کن مشکل ترحالات میں کتنے دُور دراز سفر اختیار کیے۔ یہ گوشہ نشینی کے لیے نہیں کیے گئے۔ بلکہ اصلاحِ خلق کی کوششیں تھیں جو یہ صوفیا ہی کی کوششیں تھیں جنہوں نے ہر دور میں تاریخ کے رُخ تبدیل کردیے۔ وہ کام جو شہنشاہوں کی تلواروں کے بس کا نہیں تھا۔ ان اللہ والوں کے قدم اور ان کی زبان اور ان کی صحبت کی برکت سے ہو کر رہا۔

قرآنِ حکیم نے جو تصورِ حیات دیا ہے، وہ بھی یہی ہے۔ اللہ کریم فرماتے ہیں۔ وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔ ربِّ جلیل کو اپنی صداقت کے لیے قسم دینے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ قاعدہ یہ ہے کہ آپ جس کی قسم دیتے ہیں، حقیقتاً اس کو اپنی بات پر گواہ بناتے ہیں۔ اس لیے شرعاً اللہ کے سوا کسی کی قسم دینا درست نہیں ہے کہ وہی ہر چیز پر شاہد ہے۔ جب ربِّ کریم قسم دیتے ہیں تو وہ کسی ایسی چیز کی قسم دیتے ہیں جو عام آدمیوں کے سامنے بھی اس بات پر گواہی دے رہی ہو۔ اس لیے یہاں ارشاد ہُوا "وَالْعَصْرِ" قسم ہے زمانے کی — کہ ادبارِ زمانہ، ادوارِ زمانہ، یہ شب و روز، یہ صدیوں کی آمد و رفت اس بات پر گواہ ہے "اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ" کہ نسلِ انسانی سراسر خسارے میں گئی۔ عمریں گزاریں سلطنتیں

بنائیں۔ محل بنائے۔ قلعے بنائے، حکومتیں بنائیں، خزانے جمع کیے اور چھوڑ کر چلے گئے۔ اور لوگوں نے ان کا مال تو کھا لیا لیکن انہیں یاد نہیں رکھا۔ آپ دیکھیں ہمارا معاشرہ سالگرہ مناتا ہے۔ "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو" اب تو خیر لوگ بہت آگے چلے گئے ہیں۔ اب تو قبر پر رکھ کر کیک کاٹتے ہیں اور کہتے ہیں "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو" لیکن زندگی میں بھی یہ بھول جاتے ہیں کہ جسے آپ برتھ ڈے کی مبارک دے رہے ہیں وہ تو موت کے ایک سال قریب چلا گیا ہے۔ اس میں اور موت میں ایک سال کا فاصلہ کم ہو گیا ہے تو یہ سارے لوگ کہاں جاتے ہیں۔ کوئی نہیں انہیں جانتا۔ کوئی نہیں انہیں پوچھتا۔ کوئی ان کی خبر نہیں لاتا۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ سارے انسان خسارے میں ہیں۔ مگر سوائے ان لوگوں کے، استثنا دیا ہے اس میں، کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو خسارے میں بھی نہیں رہتے۔ بلکہ بہت منافع کما لیتے ہیں۔ کون لوگ "اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ"۔ حقیقی منافع کمانے والے لوگوں میں چار اوصاف گنوائے ہیں اللہ کریم نے۔

ایمان لاتے ہیں اور عمل صالح کرتے ہیں۔ یعنی ایمان کے ساتھ آپ قرآنِ حکیم میں جہاں دیکھیں گے وہاں اٰمنوا کے ساتھ آپ کو عملوا الصّٰلحٰت پیوستہ نظر آئے گا کہ ایمان بغیر عمل کے اپنی کوئی پہچان نہیں رکھتا۔ عمل ہی ایمان کی کسوٹی بھی ہے ایمان کی پہچان بھی ہے۔ ایمان کا گواہ بھی عمل ہے اور ایمان چاہتا ہے عملِ صالح کو۔ عملِ صالح کا معیار کیا ہو گا۔ جو عمل محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو جائے وہ صالح عمل ہے۔ جس عمل کو آپ سے نسبت نہیں ہے وہ غیر صالح ہے۔ خواہ وہ کسی کو کتنا پسند ہو۔ یعنی عمل کی صلاحیت یہ ہے کہ اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات سے نسبت ہو جائے۔ اگر حضورؐ سے نسبت نہیں ہے مجھے اور آپ کو۔ کسی دوسرے کو وہ عمل کتنا پسند ہو۔ وہ عمل صالح نہیں ہے۔ غیر صالح ہے۔ آپ اسے رسم کہہ سکتے ہیں۔ آپ اسے رواج کہہ سکتے ہیں۔ آپ اسے عملِ صالح نہیں کہہ سکتے۔ اب یہاں یہ رب جلیل نے بس نہیں کر دیا۔ اگرچہ ہم یہاں تک بھی پہنچنے سے رہے کہ پہلی بات تو یہ ہمارا دعویٰ ایمان تشنۂ تکمیل ہوتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں لیکن ہمیں شرائطِ اسلام

کی خبر نہیں ہوتی۔ اور یہ یاد رکھیں کہ فرائض کو جاننا فرض ہے۔ عقائد میں تقلید نہیں ہوتی۔ تقلید فقہی احکام میں ہوتی ہے۔ عقائد میں ہر شخص آزاد ہے میرا اپنا عقیدہ ہے۔ آپ کا اپنا عقیدہ ہے، میں خود مکلف ہوں۔ عقائد کو جاننے کا اور آپ میں سے ہر ایک مکلف ہے۔ عقائد کو جاننے کا۔ ذات باری کے متعلق ہمیں کیا ماننا ہے۔ صفات باری کے متعلق کیا ماننا ہے۔ نبوت و رسالت کو ہمیں کس طریقے سے ماننا ہے۔ ملائکہ یا آخرت یا برزخ یا ثواب و عذاب ہمیں کس طرح سے ماننا ہے۔ ان سب کا جاننا فرض عین ہے۔ ہر مسلمان مرد اور عورت پر۔ اور ہر شخص کا ایمان ذاتی ہے۔ اگر کوئی ان باتوں کو نہیں مانتا۔ تو اس کا ایمان ناقص ہے۔ مکمل نہیں ہے اس لیے یہ فرض عین ہے کہ اپنے قریب جاننے والے سے ان چیزوں کو جانیں۔ جب جانتے نہیں ہیں تو مانتے کیسے ہیں۔ جو شخص جانتا ہی نہیں ہے۔ ایک بات۔ مانتا کیسے ہے۔

اس کے بعد عملوا الصٰلحٰت آتا ہے فرض کا جاننا فرض ہے۔ سنت کا جاننا سنت ہے۔ واجب کا جاننا واجب ہے۔ مستحب کا جاننا مستحب ہے۔

روزمرہ کے احوال کے بارے، حلال حرام کو جاننا فرض و سنت کو پہچاننا، یہ مسلمان مرد و عورت پر فرض عین ہے۔ اس سے کسی کو چھٹکارا نہیں۔ اس سے زیادہ وسیع تر علوم جاننا، یہ فرض کفایہ ہے کہ شہر میں، گاؤں میں، قوم میں چند آدمی بھی فاضل ہوں تو وہ سب کے لیے کفایت کرتے ہیں۔ ہر بشر کے لیے مقتدر عالم ہونا ضروری نہیں ہے۔ لیکن عقائد ایمانیات اور حلال و حرام اور روزمرہ امور کے متعلق جاننا، یہ سب متعلق ہیں۔ میں بھی آپ بھی، ہماری مائیں بہنیں بھی، بیویاں بھی، بچے بھی۔ بیٹے بھی بیٹیاں بھی ۔۔ اور آج اگر ہم اپنے اردگرد بستے ہوئے لوگوں سے عقیدہ پوچھیں ۔۔ ارے یہ لا الٰہ الا اللہ آپ نے یاد کروادیا۔ وہ بھی درست نہیں ہے بیشتر کا۔ کوئی پیش پڑھتا ہے کوئی زیر پڑھتا ہے۔ ننانوے فیصد کو خود کلمہ کا معنیٰ ہی نہیں آتا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ جانتا ہی نہیں کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا معنیٰ کیا ہے اور اس کے ساتھ ان عقائد کو، اللہ کی ذات اور اس کی صفات کو جاننا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی تو کسی نے ضرورت ہی نہیں

سمجھی۔ نہ پیر نے مرید کو بتایا۔ نہ مولوی نے شاگرد کو بتایا۔ اور نہ کسی شاگرد نے مولوی سے پوچھا نہ محلّے والوں نے اپنے امام سے پوچھا۔ نہ کسی نے اس کا تکلّف کیا۔ اسی بات پر رہے مسلمان ہیں۔ مسلمان ہیں۔ ٹھیک ہے۔

مسلمانی یوں قبول نہیں ہوگی۔ جب قبر میں داخلہ ہوتا ہے تو سب سے پہلا سوال ہوتا ہے مَنْ رَّبُّكَ ۔ کون ہے ربّ تیرا۔ صفاتِ باری سب سے پہلے آجاتی ہیں۔ اوصافِ باری سب سے پہلے آجاتے ہیں۔ اس مَنْ میں ذاتِ باری کے متعلق بھی سوال موجود ہے۔ اور صفاتِ باری کے متعلق بھی موجود ہے۔ جو ساری زندگی سیکھے گا نہیں وہ مانے گا کیا! اور جو مانے گا نہیں وہ بتائے گا کیا۔ سب سے پہلے بنیادی کمزوری ہمارے ایمان میں موجود ہے۔ اگر دس آدمیوں کو علم ہے تو وہ نہ ہونے کے برابر۔ آپ اپنے گاؤں میں، اپنے دیہات میں، اپنے اردگرد، اپنے معاشرے میں آدمی پیدا کریں۔ کتنے آدمی ہیں جو ذاتِ باری اور صفاتِ باری میں تمیز کر سکتے ہیں کہ ذات کیا ہے اور صفت کیا ہوتی ہے لیکن افسوس اس بات پر آتا ہے کہ ایمان بتانے کی بجائے ان پر کفر کے فتوے ڈالے جاتے ہیں۔ شغل بن گیا ہے آج کے مولوی کا۔ منبر پر کھڑے ہو کر نعرے لگائے جاتے ہیں۔ فلاں کافر فلاں کافر۔

یار یہ بھی کوئی بتانے کی بات ہے۔ جو کافر ہے وہ کافر ہے۔ اسے چھوڑ دو۔ جو مسلمان ہے اسے تو سنبھالو۔ اسے تو کچھ بتاؤ کہ اسلام ہے کیا۔ پھر اس کے بعد عملِ صالح کی باری آتی ہے۔ ایمان ناقص ہو تو عملِ صالح کی توفیق ہی نہیں ہوتی۔ جب تک ایمان درست نہ ہو کوئی عمل عملِ صالح ہوتا ہی نہیں۔ اسی لیے حدیث شریف میں موجود ہے۔ قرآنِ حکیم میں موجود ہے کہ کافر اگر کوئی اچھا کام بھی کرے تو اس کی نیکی دنیا میں اسے لوٹا دی جاتی ہے کہ آخرت میں اسے کوئی ثواب نہیں ملے گا کیونکہ آخرت کے متعلق اس کا نظریہ اور عقیدہ ہی درست نہیں۔ کافر کے سینگ نہیں ہوتے۔ جس کا بھی عقیدہ ذاتِ باری کے متعلق درست نہ ہو وہ ہی کافر ہوتا ہے اس میں خواہ میں آجاؤں آپ آجائیں کوئی دوسرا آجائے ہم یقین نہیں کر سکتے۔ یہ ظلم

ہے کسی کو کہنا تُو کافر ہے تُو کافر ہے۔ کسی فرد کی تعین کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ ہم نظریات متعین کر سکتے ہیں۔ ان حدود سے جو نکل جائے گا وہ مسلمان نہیں ہے۔ جو ذاتِ باری اور صفاتِ باری کے متعلق ہی نہیں جانتا وہ مانتا کب ہے۔ اور مانتا نہیں تو اور کافر کا دُم ہوتا ہے۔ اُسی کو کافر کہتے ہیں جس کا عقیدہ انبیاء کے متعلق اور نبوت کے متعلق کتابِ الٰہی کے متعلق ضروریات دین کے متعلق درست نہیں ہے وہ کیسے مسلمان ہے۔ اور ایمان سے کہیں آپ اپنے دیہات میں اپنے گاؤں میں اپنے محلے میں کتنے ایسے لوگ پیدا کر سکتے ہیں جنہیں ان باتوں سے آگاہی ہو۔ ان باتوں کو جانتے ہوں۔ جب ایمان ہی درست نہیں ہوگا تو عمل کے صالح اور غیر صالح ہونے کا درجہ تو ایمان کے بعد آتا ہے۔ ایمان درست ہو، پھر اعمال میں عمل کی سند لیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے، پھر عمل صالح بنتا ہے اور اللہ فرماتا ہے کہ ایمان اور عملِ صالح سے گذارا نہ کرے۔ یعنی جو مطالبہ ہے قرآنِ حکیم کا وہ یہ ہے کہ اس کے اندر اتنا ایمان ہو اور اتنا پختہ عملِ صالح ہو کہ وہ دریا کی طرح کناروں سے باہر نکلے "وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ" پھر وہ دوسروں کو حق کی تلقین کیا کرے۔ تب ہی کرے گا۔ جب اس کا سینہ خود حق سے لبریز ہو۔ "وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" اور صرف خود صبر نہ کرے بلکہ دوسروں کو صبر کرنا سکھا دے۔

ایک ہوتا ہے حق پہ قائم رہنا ایک ہوتا ہے مصائب و شدائد میں صبر کرنا قرآن کریم فرماتا ہے ایسا مسلمان معیاری مسلمان نہیں ہے۔ ایک بزرگ نے کسی سے سوال کیا تھا کہ آپ کا گزارہ کیا ہے تو کہنے لگا کہ مل جائے تو شکر کرتے ہیں نہ ملے تو صبر کرتے ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا فرمایا کہ ہمارے محلے کے کتے بھی یہی کرتے ہیں مل جائے تو شکر کرتے ہیں نہ ملے تو صبر کر لیتے ہیں۔ یعنی یہ کوئی کرنے کا کام نہیں ہے۔ ساری مخلوق کرتی ہے۔ نہ ملے گا تو کیا کرے گا بجز صبر کے۔ اللہ کریم فرماتے ہیں یہ صبر نہیں بلکہ وہ صبر چاہیئے کہ شدائد پر بھی اس کا کردار ایسا مثالی ہو کہ اسے دیکھ کر دوسرے لوگ اپنی تکالیف بھول جایا کریں اور انہیں صبر کی "اکمل" آجائے۔ انہیں پتہ چل جائے

صبر کیا ہوتا ہے۔ اور یہی اوصاف تھے صحابہ اکرامؓ میں کہ جہاں سے گزرے کافروں کو ایمان عطا کر گئے۔ جہاں سے گزرے بدکاروں کو عملِ صالح عطا کر گئے۔ جہاں سے گزرے اخلاقِ حق کے دریا بہا گئے۔ جس طرف سے نکل گئے لوگوں کو صبر کرنا سکھاتے چلے گئے۔ اللہ اللہ اللہ!

حضرت خنسہ رضؓ ایک شاعرہ تھیں عرب کی بڑی مشہور۔ آج بھی عربی ادب میں ان کے شعروں سے سند لی جاتی ہے۔ الفاظ کے معانی پر اور محاسن کے استعمال پر اللہ کریم نے انہیں بہت ملکہ دیا تھا ادب میں اور شعر و شاعری میں۔ ان کا ایک بھائی تھا "صخر" نام تھا اس کا۔ وہ جوانی میں فوت ہو گیا۔ وہ بھی اس وقت نوجوان تھیں۔ تو انہوں نے اس کے مرثیے میں شعر کہا تھا۔

یذکرنی طلوع الشمس صخرا
وذکرہٗ بکل غروب الشمس

اللہ کی بندی نے ایسے الفاظ پرو دیئے کہ وہ فرماتی ہیں کہ سورج طلوع ہوتا ہے تو جہاں پر رونق آجاتی ہے۔ حیات آتی ہے۔ ہر شخص اپنے کام میں لگ جاتا ہے۔ بے شمار مصروفیات لاتا ہے سورج کا طلوع ہوتا ہے تو مجھے "صخر" کو یاد دلا دیتا ہے۔ اور سورج تھک ہار کر ڈوب جاتا ہے۔ شاعرہ بھی تھیں۔ شاعر تو مرد ہو تو اس کا دل عورتوں جیسا ہوتا ہے اور وہ تو تھیں بھی عورت۔

اللہ تعالیٰ نے جب انہیں دولتِ ایمان سے مالا مال کیا۔ بھائی ان کے اور بھی تھے۔ کوئی ایک نہیں تھا۔ بوڑھی ہو گئیں۔ بال سفید تھے۔ جب قادسیہ کا معروف رن پڑا تو خود اس حملہ میں شریک تھیں بنفسِ نفیس۔ چار جوان بیٹے تھے۔ چاروں ساتھ لائی تھیں۔ اب آپ اندازہ کریں۔ ایک عورت ہے۔ شاعرہ ہے۔ ادیب ہے۔ ایک بھائی کی جدائی میں اس کی کیفیت یہ ہے اور جب بوڑھی ہو چکی ہے۔ لبِ گور ہے۔ اپنی نشانیاں چار بیٹے ہیں خیمے میں بیٹھی ہوئی چاروں کی شہادت کی اطلاع ملتی ہے تو باہر نکل آئی ہے۔ چہرہ کھلکھلا اٹھتا ہے۔ کہتی ہے خدایا تیرا شکر ہے۔ کہ تو نے مجھے میدانِ حشر میں اس قابل کر دیا کہ میں شہیدوں کی ماں کے ساتھ کھڑی ہو سکوں۔

تصوف تو اس کا نام ہے کہ کہاں سے لیا اس عورت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور کن عظمتوں سے آشنا کر دیا کہ ایک بھائی

کی طبعی موت پر اس کا تاثر یہ ہے اور بڑھاپے میں چار جوان بیٹیوں کی شہادت پر اس کا تاثر وہ ہے — یہ کیا ہے — یہ تصوف ہے۔ یہ اللہ اللہ کی برکت ہے۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض و برکات ہیں کہ انسان کا ایمان معیاری اور مثالی ہو جائے۔ جہاں ذاتِ باری اور صفاتِ باری پر حرف آنے لگے وہاں سے بدک جائے۔ کبھی اسے قبول نہ کر سکے۔

جس طرح آپ پتھر کھا نہیں سکتے۔ کوئی کلمہ جو ذاتِ باری پر یا صفاتِ باری پر جس سے حرف آتا ہو وہ حلق سے نہ اترے۔ عقائدِ اسلامیہ کے خلاف کوئی لفظ قبول کرنے کو جی نہ چاہے اور عمل کی بھوک لگے نماز کے اوقات کی تلاش اور جستجو پیدا ہو جائے۔ فارغ نہ ہو بلکہ ظہر پڑھ چکے تو طلب رہ جائے کہ عصر کا وقت ہو اور میں پھر سجدے کروں۔ نیند اُسے نوافل سے بے زار نہ کر دے۔ اللہ کریم نے اپنے بندوں کے اوصاف میں فرمایا ہے کہ اُن کے بستر اُن کے پہلوؤں سے خالی رہتے ہیں — اتفاقِ حق کی عملی تصویر ہو۔ اور تلقینِ صبر زبان سے نہیں اپنے کردار سے کرتا ہو۔ ہم اُس کو صوفی مانیں گے خواہ اُس معیار پر ہم بھی فیل ہو جائیں تو ہمارا نام تصوف کے رجسٹر سے کاٹ دینا آسان ہے لیکن تصوف کو بدنام کرنا آسان نہیں۔

یہ بہتر ہے کہ مجھے بدکار کہہ دیا جائے لیکن نیکو کاروں کو بدنام نہ کیا جائے۔

ہمارا تصوف رواجی ہرگز نہیں ہے۔ جو شخص اپنی نانِ شبینہ اللہ کی کائنات میں پیدا نہیں کر سکتا وہ کسی طرح بھی کسی تصوف کے دعوے کا مستحق نہیں ہے۔ جو شخص عملی زندگی سے پہلو تہی کرتا ہے اسے کبھی اللہ اللہ راس نہیں آئے گی۔ جو شخص زندگی کی جدّوجہد سے گھبراتا ہو وہ اس راستے کا مسافر نہیں ہے۔ یہ وہم چھوڑ دے کہ اللہ اللہ کرنے سے زندگی کی رفتار بدل جائے گی۔ زمانہ بدل جائے گا۔ حالات بدل جائیں گے۔ ہر طرف آسانیاں ہی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ زندگی اپنی روش پر رہے گی — زمانے کی رفتار پر اپنی روش پر رہے گی — اور صوفی وہ کہلائے گا جو اس جدّوجہد زمانہ میں اپنا راستہ شیر کی طرح بناتا ہوا چلا جائے۔ خدا بزدلوں کا ساتھ نہیں دیتا۔ خدا کو زیب ہی نہیں دیتا کہ بھاگنے والوں کے ساتھ بھاگ رہا ہو۔ یہ اس کی

شان سے بعید ہے۔ جو لوگ جدوجہدِ حیات سے فرار کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ اللہ کی شان کے خلاف ہے کہ وہ بھی ان کے ساتھ بھاگنا شروع کر دے۔ وہ ان کا ساتھ دیتا ہے جو اس کی راہ میں جان دے دیتے ہیں۔ ان کے لیے کہتا ہے انہیں مردہ نہ کہو۔ انہوں نے موت کو شکست دے دی تھی۔ لیکن وہ موت کی وادی سے گزر گئے۔ واپس نہیں پلٹے۔ موت انہیں واپس نہیں کر سکی۔ اسی لیے انہیں مردہ مت کہو۔۔۔

یہ میں نے اس لیے آپ کا اتنا وقت لیا ہے کہ اگلے روز مجھے ایک خط ملا۔۔ اس میں تذکرہ یہ تھا کہ آپ ذکر و اذکار کی اتنی تلقین کرتے ہیں کہ شاید کچھ عرصہ بعد آپ لوگوں کو نماز روزے سے بھی چھڑا دیں اور انہیں صرف ذکر پر ہی لگا دیں۔۔۔

کتنے سادہ ہیں یہ لوگ۔ انہیں نہ اپنی زندگی کا کچھ فکر ہے۔ نہ دوسروں کا۔ یہ اولادوں کو پالتے ہیں کہ یہ بڑے ہو کر پیسے کمائیں گے۔ یہ ان کا نظریۂ حیات ہے۔ یہ بچوں کو پڑھاتے ہیں کہ یہ پڑھ کر پیسے کمائیں۔ ان کا نظریۂ حیات ہی کوئی نہیں مقصدِ حیات ہی کوئی نہیں نہ اپنے لیے۔ نہ آنے والی نسل کے لیے۔ ان کے سامنے کوئی منزل ہی نہیں ہے۔ یہ جانوروں کی طرح پیٹ بھرنے کی فکر میں پوری عمر ضائع کر دیتے ہیں۔۔۔ جس طرح ایک حیوان، ایک درندہ، ۔۔۔۔ ایک کیڑا، ایک پرندہ اس کی زندگی کی تگ و تاز ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ دانہ کیسے کھائے گا۔ بچوں کو بھی یہی سکھاتا ہے کہ کیسے کھانا ہے ۔۔ اور اس کے بعد مر جاتا ہے آج کا انسان بھی اسی منزل پر کھڑا ہے اور ہمارا مسلمان بھی اسی کی بغل میں بیٹھا ہے۔۔ یہ صرف پیٹ بھر رزق پیدا کرنا ہی زندگی کا کوئی مقصد ہے۔ یہ تو وہی بات ہے کہ اس مقصد کو اگر سامنے رکھیں تو ہر چوپایہ، ہر کتا، ہر بلا سبھی یہ مقصد لیے پھرتے ہیں۔

مقصدِ حیات یہ ہے کہ انسان جس گزرگاہ سے گزر جائے صدیوں تک اس کے نقوشِ کفِ پا کو لوگ تلاش کرتے رہیں۔ انسان وہ ہے جو سراپا انقلاب ہو۔ جو دلوں کو بدل دے جو روش کو بدل دے۔ رفتارِ زمانہ بدل دے جو سوچوں کو بدل دے۔ جو لوگوں کو زندگی کے مقاصد سے آشنا کر جائے۔ اور یہ تگ و تاز انسانیت کو دی ہے آقائے نامدار محمد الرسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے۔

جس کا بھی تعلق حضورؐ سے قائم ہوگا۔ کم از کم یہ ہے کہ وہ خود کو، اپنی اولاد کو، اپنے گھر کو، اپنے اہل و عیال کو تو زندگی کے مقصد سے آشنا کر جائے۔ قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا۔ یعنی کم از کم معیار یہ ہے کہ تم ایک خلق کو متاثر نہیں کر پاتے۔ تو اپنی جان، اپنے گھر والوں کی جان کو دوزخ سے چھڑا لو۔ اتنا بھی نہیں کر سکتے۔۔۔ اگر آپ نے ذکر اذکار کا مطلب محض انوارات کا مشاہدہ سمجھا تو آپ نے غلط سمجھا آپ نے اگر ذکر اذکار کا مفہوم ظہور کرامات سمجھا تو آپ غلط سمجھے ذکر اذکار کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کو عملی زندگی کے لیے تیار کر دے۔ آپ میں جرأت رندانہ پیدا کر دے۔ آپ کو وہ قوت عطا کرے کہ میدانِ جدوجہد میں آپ کے نقوش ثبت ہو جائیں۔ آپ جس فیلڈ میں کام کرتے ہوں۔ تو مثالی ورکر بن جائیں۔ آپ کی دیانت، آپ کی امانت، آپ کی قابلیت، آپ کی جرأت، آپ کی قوت کار مثالی ہو۔ اور لوگ یہ سوچیں کہ یہ اتنا کام کیسے کر سکتا ہے۔ جب آپ لوگوں کی فکر سے بالاتر ہو جائیں تو سمجھیں آپ میں تصوف آ گیا ہے۔ جتنے کام آپ کرتے ہیں۔ عام آدمی اتنا کام نہ کر سکے تو آپ صوفی ہیں۔ اور جتنا کام آدمی کرتا ہے وہ بھی نہ کریں تو آپ صوفی ہرگز نہیں۔ یہی سبق ملتا ہے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگیوں سے۔ انہوں نے وہ کر دکھایا جو آج کا انسان بھی نہیں سوچ سکتا۔ کر یا انہوں نے کیسے کر لیا۔

آپ اکابرین مشائخ عظام کی زندگیوں کو پڑھیں۔ یہی ہندوستان میں، پاکستان میں جو لوگ آسودہ خاک ہیں انہی کی سوانح دیکھ لیں حضرت علی ہجویریؒ کیا لاہور کے رہنے والے تھے۔ یہ معین الدین چشتیؒ کوئی اجمیر کے رہنے والے تھے۔ کہاں سے نکلے۔۔۔ یہاں آ کر انہوں نے کیا کیا۔ لوگوں کو قوتِ کار دی۔ مردہ دلوں کو حیاتِ نو عطا کی۔ ایک انقلاب لائے اپنے ساتھ۔۔۔ جس نے صدیوں تک اپنے اثرات مرتسم کر دیئے۔ یہ مر چکے ہیں۔۔۔ لیکن مرتے نہیں۔ لیکن یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ہر آنے والے کے ساتھ وہ زندہ ہیں۔ آج بھی فضا پر ان لوگوں کا تذکرہ گونجتا ہے جن کی حکومتیں ہیں، سلطنتیں ہیں، انہیں کوئی نہیں پوچھتا جو قبروں میں پڑے ہیں، ان کے نام گونجتے ہیں۔ آخر کیوں۔ اس لیے کہ انہوں نے حیات تقسیم کی۔

لوگوں میں اور انہیں انقلابِ زمانہ نے چند روز حکومت کرنے کا موقع دے دیا۔ یہ زمانہ کی گرد میں دب جائیں گی۔ یہ زمانے کے تابع ہیں اور انہوں نے زمانے پر حکومت کی ہے ان پر زمانے کی گرد نہیں پڑتی۔

تو تصوف یہ ہے کہ ایمان درست ہو۔ اعمال درست ہوں اور آدمی دوسروں کو ولولۂ حیات عطا کرنے کے قابل ہو۔ ہماری یہ جدّوجہد اسی راستے کے لیے ہے۔ اسی منزل کے لیے ہے۔۔۔ سو تذکرہ نگار بھائی تک اگر میری یہ آواز پہنچے، تو میں اسے یہ دعوت دوں گا کہ وہ کچھ عرصہ میرے ساتھ رہ کر میری اپنی عملی زندگی کو دیکھ کر رائے قائم کرے۔ جلد بازی نہ کرے۔ غائبانہ کسی پر فتوے لگا دینا یہ اچھی بات نہیں ہوتی۔ الحمدللہ میری زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔ دو طرح کی زندگی خدا نے مجھے نہیں دی۔ میں لوگوں کے ساتھ جیتا ہوں۔ لوگوں کے ساتھ مرتا ہوں، لوگوں کے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا ہے۔ میری کوئی خلوت گزینی نہیں۔ میں کبھی کسی گوشے میں نہیں بیٹھا۔۔۔ تو تبصرہ نگار کے لیے بھی میری دعوتِ عام ہے کہ وہ میرے پاس آئے، میرے ساتھ رہے، اور اس کے بعد جو بات اس کی سمجھ میں آئے وہ حق اور برملا طور پر لوگوں کو بتائے۔ آپ سب کے لیے بھی میری دعوت یہی ہے کہ نقالوں نے اس موضوع کو بہت بدنام کیا ہے۔ دنیا میں جس سے کچھ نہ ہو سکا اس نے برقعہ اوڑھ کر تصوف کا ڈھونگ رچا لیا۔

بلی کسی کے بال ہیں روٹی کے واسطے
کپڑے کسی کے لال ہیں روٹی کے واسطے
باندھے کوئی رومال ہے روٹی کے واسطے
سب کچھ بھائی کمال ہے روٹی کے واسطے

یعنی دو وقت کے کھانے کے لیے لوگوں نے پورے فیلڈ کو بدنام کر دیا۔ حقائق سے واقف نہیں ہیں۔ عملی زندگی سے آشنا نہیں ہیں۔ دس قدم چل نہیں سکتے۔ اپنے لیے ایک جگ پانی نہیں بھر سکتے۔ اور دعویٰ کرتے ہیں صوفی ہونے کا۔

مجھ پر اللہ کا احسان ہے کہ میں عملی زندگی میں بھی آج کے دور کے کسی جوان کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اگر کسی کو غلط فہمی ہو تو میرے ساتھ کاشت کاری کر کے دیکھ لے۔ زمینداری کر کے دیکھ لے۔ گولی چلا کے دیکھ لے۔ گھوڑ سواری کر کے دیکھ لے۔ موٹر چلا کر دیکھ لے۔ ہوائی جہاز اُڑا کر دیکھ لے۔ تقریر

چند ہستیوں میں سے ایک ہستی ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضؓ ہیں کہ باپ ابی سفیان رئیس مکہ (جبکہ ابھی ایمان نہیں لائے تھے) اس امید سے مدینہ بیٹی کے گھر آتے ہیں کہ صلح حدیبیہ کی تجدید میں بیٹی کا رشتہ معاون ثابت ہوگا۔ گھر داخل ہوتے ہیں چارپائی پر بیٹھنے لگتے ہیں کہ ام المومنین چارپائی سے بستر لپیٹ لیتی ہیں۔ باپ شرمندہ و حیران ہوکر پوچھتا ہے کہ بیٹی یہ کیا؟ میں تیرا باپ ہوں بڑے ناز و نعم سے میں نے پالا تھا۔ بیٹی بے لاگ جواب دیتی ہے کہ یہ بستر آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اس پر کوئی ناپاک نہیں بیٹھ سکتا۔

کچھ ایسا ہی واقعہ عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین کے ساتھ پیش آتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک غزوہ میں شریک ہیں۔ اسے خوش فہمی لاحق تھی کہ شاید مدینہ واپس نہ پہنچ پائیں۔ فخریہ انداز سے کہنے لگا کہ آج مدینہ میں وہ داخل ہوگا جو عزت والا ہوگا — اللہ کی شان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بعافیت مدینہ تشریف فرما ہوئے تو انہیں بھی یہ بات سن کر دکھ ہوا — حضرت عبداللہؓ کو جب اپنے باپ کے اس غیر معقول قول کی خبر ہوئی تو حمیت ایمانی سے بھڑک اٹھے۔ تلوار اٹھائی اور راستہ میں ہی باپ کا راستہ روک کر کھڑے ہوگئے اور کہا کہ عزت والی ہستی مدینہ تشریف فرما ہے اس لیے آپ نہیں داخل ہو سکتے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ بات پہنچی تو جب کہلا بھیجا کہ باپ کو آنے دو تب جانے دیا۔

اسی طرح کا ایک اور واقع کہ عبداللہ بن ابی بکرؓ اپنے دور جہالت میں اپنے باپ حضرت ابو بکرؓ کے بالمقابل جنگ میں شریک ہوئے تھے جو ایمان کی دولت سے مستفیض ہوئے تو از راہ سخن باپ سے کہنے لگے کہ ابا جان ایک دفعہ آپ میری زد میں آگئے تھے مگر باپ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ پیکر صدق نے جواباً کہا کہ بیٹا تو ایمان کے نشہ سے محروم تھا اس لیے چھوڑ دیا۔ خدا کی قسم اگر تم میری تلوار کی زد میں آجاتے تو کبھی نہ بچ پاتے۔

حضرت زید بن حارثہؓ خاندانی آسودہ حال شخصیت تھے۔ بچپن میں والدین سے کسی حادثہ میں بچھڑ گئے اور غلام بنا لیے گئے — خوش قسمتی سے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس پر معمور ہوگئے۔ والدین رو رو کر نڈھال ہیں اور ہر قیمت پر بیٹے کو

حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تلاش بسیار کے بعد پتہ چلتا ہے تو کاشانۂ اقدس پر دست بستہ حاضر ہوتے ہیں کہ بیٹا واپس دے دیجئے جو قیمت مانگیں گے دیں گے۔ نبی کریم رؤف الرحیمؐ نے جواب دیا کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ جس طرح زیدؓ چاہے۔ والدین بہت خوش ہوتے مگر اُن کی امیدوں کو اس وقت دھچکا لگا جب بیٹے نے باپ کے ساتھ واپس جانے اور دامنِ رحمتؐ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ آخر ناچار اس اُمید پر ہی واپس ہو لیے کہ بیٹا خوش تو ہے

میرے بھائیو آپ نے غور کیا ہے کہ یہ کیا تعلق ہے ایک کا ایک دوسرے کے ساتھ۔ ایک طرف بیٹی باپ کو بستر پر بیٹھنے نہیں دے رہی۔ بیٹا باپ کا راستہ روکے کھڑا ہے — باپ بیٹے کی گردن اڑا دینے سے کہتا ہے کہ کبھی گریز نہ کرتا۔ بیٹا غلام بن کر رہنا پسند کرتا ہے مگر والدین اور قبیلہ میں واپس جانا نہیں چاہتا — ان شخصیتوں کو دولتِ ایمان نصیب ہے۔ تعلقِ مصطفےٰ حاصل ہے۔ جبھی تو حضرت عمرؓ حرمِ نبیؐ میں جب اپنی بیٹی ام المؤمنین حضرت حفصہؓ کو ڈانٹتے ہیں تو بیٹی باپ سے کہہ دیتی ہے کہ آپؓ کو ام المؤمنین سے اس طرح بات نہیں کرنا چاہیئے۔ باپ اور بھی عمرؓ اپنی بیٹی کے سامنے جواب دینے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پاس کھڑے سُن کر مسکرا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عمرؓ یہ ٹھیک کہتی ہیں۔

ایک دوسرے صحابیؓ اپنی تمام جائیداد نام و عزت ٹھکرا کر حتیٰ کہ بدن کے کپڑے بھی اُتار کر پھینک دیتے ہیں۔ ایک کمبل کے دو ٹکڑے اوڑھ کر دامنِ مصطفےٰ تھام لیتے ہیں۔

ہند نامی ایک انصاریہ کے باپ، بھائی، اور بیٹے اور خاوند سب شہید ہو جاتے ہیں مگر زبان پہ کلمہ ہے تو ایک ہی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیسے ہیں۔

خدا کرے ہمیں بھی کوئی نسبت ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کی — ہمارا بھی کوئی تعلق ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت اور عقیدت کا — ہم نہ مہاجر ہوں نہ ہی سندھی، پٹھان ہوں نہ ہی پنجابی اور نہ ہی بلوچ — ہم ہوں تو اللہ کے سپاہی اور غلامانِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم (آمین)

ع جس کے حضورؐ ہو گئے اس کا زمانہ ہو گیا

●●

عورت کی عظمت

(پروفیسر عبدالرزاق۔ ایم اے)

فالصالحات قانتات
حافظات للغیب بما
حفظ اللہ (۴ : ۳۴)

ہر خوبی یا اوصافِ عالیہ کے مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ اور یوں تو ہر درجہ مستحسن اور محبوب ہوتا ہے مگر انسان کی فطرت یہ ہے کہ اسے ہمیشہ خوب تر کی تلاش اور خواہش ہوتی ہے بلکہ جی چاہتا ہے کہ ہر خوبی اور کمال کا انتہائی بلند درجہ حاصل ہو جائے اور سچ پوچھیے کہ انسان کی ساری تگ و دو تمام جہدِ مسلسل اسی کمال کے حصول کے لیے ہوتی ہے میدانِ عمل گو مختلف ہوتے ہیں مقاصد اور نصب العین جُدا ہوتے ہیں مگر ان میں یہ قدر مشترک لازماً موجود ہوتی ہے کہ جو خوبی اور کمال ہو، معیاری اور مثالی ہو۔

علم سے بے بہرہ اور تہذیب سے ناآشنا ایک دیہاتی کو دیکھیے وہ اگر زمیندار ہے تو اس میں اسے نام پیدا کرنے کی خواہش ہے اور چاہتا ہے کہ بہترین زمیندار سمجھا جاؤں صنعتکار ہے تو مثالی کاریگر بننے کی خواہش ہے۔ پڑھا لکھا مہذب شہری ہے تو اسے اپنے فن اور اپنے کام میں امتیازی حیثیت حاصل کرنے کی دُھن ہے۔ سیاسی ذہن کا ہے تو نمائندگی اور اقتدار کے اعلیٰ منصب پر اس کی نگاہ جمی ہوئی ہے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ گویا انسانی فطرت کا بنیادی مسئلہ ہے

اسلام دینِ فطرت ہے۔ اس کے سارے احکام اس کی تمام تعلیمات اس کے جملہ قوانین و ضوابط انسانی فطرت کے عین

مطابق ہی نہیں بلکہ انسانی ضرورت کو پورا کرنے کی واحد صورت ہے۔

اسی داعیہ یعنی خوب تر کی تلاش کے ساتھ انسان کی اس فطری خصوصیت کو شامل کیجیے کہ وہ مدنی بالطبع واقع ہوا ہے یعنی مل جل کے زندگی بسر کرنا اس کی فطرت میں داخل ہے۔ اسی خصوصیت کا کرشمہ ہے کہ اس کی وجہ سے عائلی زندگی کی بنیاد پڑتی ہے اور یہی ترقی کر کے اجتماعی، قومی اور بین الاقوامی صورت اختیار کرتی ہے۔ ایک گھر یا کنبہ کی بنیادی اکائی وہ رشتہ ہے جو ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان خاوند اور بیوی کے عنوان سے قائم ہوتا ہے۔

مرد کی فطرت میں فعالیت ہے اور عورت میں انفعالیت لہٰذا فطری بات ہے کہ مرد کو ایک معیاری اور مثالی رفیقِ حیات کی تلاش ہوتی ہے تو انسان کے اس فطری داعیہ کی تسکین اور تکمیل کے لیے اسلام نے جہاں مرد کو اس معیار سے آشنا کیا جو اس کو معیاری رفیق کی تلاش میں رہنمائی کرے اور عورت کو ان خوبیوں سے روشناس کرایا جو اس کی عظمت اور رفعت کی آئینہ دار ہیں ―

اس سلسلے میں اسلام نے اصولی تعلیم دیتے ہوئے سب سے پہلے یہ بتایا کہ ایک گھر یا ایک کنبہ کے نظام کو صحیح طور پر چلانے کے لیے ضروری ہے کہ کوئی ایک فرد ذمہ دار، نگران اور محافظ مقرر ہو باقی افراد اس کی رہنمائی میں امن و سکون سے ترقی کی راہ پر گامزن رہیں۔ یہ ایسی ضرورت ہے جس سے کوئی انسان ناواقف نہیں۔ کوئی مدرسہ ہو، کالج ہو، فیکٹری ہو، ادارہ ہو۔ جب تک کوئی ایک فرد اس کا نگران اور ذمہ دار مقرر نہ کیا جائے کوئی کام نہیں چل سکتا۔ اور صرف نگران مقرر کرنا ضروری نہیں ہوتا بلکہ یہ دیکھنا لازمی ہوتا ہے کہ جو کام اسے سونپا جا رہا ہے کیا اس میں اس کی صلاحیت بھی ہے اور جب ایسی صورت سامنے آئے کہ ایک سے زیادہ باصلاحیت افراد موجود ہوں تو فیصلہ کرتے وقت یہ دیکھا جاتا ہے کہ ان میں نسبتاً سب سے بہتر کون ہے۔

قرآن مجید کی جس آیت کا ایک حصہ اوپر نقل کیا گیا ہے۔ اس کی ابتدا اسی اصول کے بیان سے ہوتی ہے کہ جب ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان خاوند اور بیوی کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ ایک خاندان کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ اس لیے اس سلسلے میں انسان کی

پہلی اور بنیادی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے بتا دیا کہ اس ادارے کا نگران اور محافظ مرد ہوگا۔ کیونکہ خالق کائنات نے تخلیقی طور پر اس میں قیادت، نگرانی اور حفاظت کی صلاحیت رکھ دی ہے اور بیرونی ماحول کے تقاضوں کو پورا کرنے کی ذمہ داری اسی پر ہے۔ عورت کو خارجی حالات اور معاشی فکر سے آزاد قرار دے کر اس کی ساری توجہ اور تگ و دو کا رُخ گھر کے اندر کی تعمیر، تزئین اور اصلاح کی نگرانی اور رہنمائی میں بقائے نوع اور اصلاح و تربیت اولاد کو سرِ فہرست رکھ دیا۔ یہ کام بظاہر معمولی نظر آتا ہے مگر اتنا کٹھن ایسا وقت طلب اور دقت طلب ہے کہ عورت اس کے علاوہ کسی اور بوجھ کی متحمل ہی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ان فرائض کی کما حقہٗ بجا آوری کے لیے جن اوصاف اور جن خوبیوں کی ضرورت ہے اس کی نشاندہی کر دی اور فرمایا کہ:

(۱) صالح عورت وہ ہے جو نگران کار کی ہدایت اور رہنمائی میں یہ تعمیری منصوبہ پورا کرنے کا جذبہ رکھتی ہے جس کا نام قرآن نے "قانتات" رکھا ہے۔ یہاں دو باتیں خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ اوّل یہ کہ صالح کے معنی نیک کے کیے جاتے ہیں۔ مگر اس نیک کے لفظ کے مفہوم میں جو وسعت ہے اس پر نگاہ نہیں رکھی جاتی۔ نیک وہ ہے جو صحیح کام صحیح صورت میں صحیح طریقے سے صحیح وقت پر کرے۔ اسی کو دوسرے لفظوں میں کام کرنے کی صلاحیت بھی کہتے ہیں۔ گویا "صالحات" کے لفظ سے یہ ظاہر ہے کہ یہاں معیاری عورت کی پہلی صفت یہ بتائی کہ اس میں عورت کے فرائض ادا کرنے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہو۔ مگر یہ صلاحیت تو قدرت کا عطیہ ہے اور تخلیقی امانت ہے۔ یعنی غیر اختیاری فعل ہے اس لیے عورت پر اس کی ذمہ داری کیوں ڈال گئی تو یہاں یہ مفہوم ظاہر ہوتا ہے کہ خالق نے اسے عورت بنا کر اس میں صلاحیت تو رکھ دی ہے اب اس صلاحیت کو بروئے کار لانا عورت کے ارادہ اور جذبہ پر منحصر ہے۔ تو اس کا مفہوم یہ نکلا کہ معیاری عورت وہ ہے، جو خداداد صلاحیتوں کو اپنے ارادہ اور پسند سے بروئے کار لا کر نگران کار کی ہدایت کے مطابق انسانیت کی تعمیر اور ترقی میں کوشاں ہو۔ اگر یہ نہیں تو وہ عورت نہیں بلکہ عورت کی شکل میں ایک بے نام مخلوق ہے۔

دوسرا لفظ "قانتات" ہے۔ اسے باطل قوتوں اور اسلام دشمن اقوام اور تحریکوں نے خوب ایکسپلائٹ کیا ہے۔ اس کا مفہوم ہے "اطاعت شعار"۔ اسلامی معاشرے کو بگاڑنے اور اسلام کو بدنام کرنے کے لیے مغرب نے عورت کو بغاوت پر آمادہ کرنے کے لیے یہ پڑھایا کہ اسلام نے تو عورت کو مرد کا غلام نوکر اور بندۂ بے دام کی حیثیت دی ہے حالانکہ یہ ہر طرح مرد کے برابر ہے۔ اس لیے "آزادیٔ نسواں" اور "مساوات مرد و زن" کے پرفریب نعروں اور عنوانوں کے ساتھ اسلام کے خلاف تحریکیں چلادیں اور عورت بھی ایسی بھولی بھالی مخلوق ہے کہ وہ باطل کے دام ہمرنگ زمین میں پھنس کر رہ گئی اور ایسی پھنسی کہ خود اس جال کے حلقوں کو تنگ کرتی جارہی ہے، اور اپنے مقصدِ تخلیق سے ہٹ کر بے راہ رو ہو رہی ہے اور ستم بالائے ستم یہ فطرت کے خلاف بغاوت کو اپنی خوبی سمجھتی ہے۔ واقعی باطل کی چال ایسی کامیاب ہوئی کہ

کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری
کی کیفیت پیدا ہوگئی۔

اس اطاعت شعاری کے مفہوم اور اس کے تقاضوں پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو باطل کا سارا استدلال رد ہو جاتا ہے مگر یہ تو جب ہو کہ کوئی غور کرنے پر آمادہ بھی ہو۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ فرض کیجیے ایک کالج ہے۔ پرنسپل اس کا نگران اور ذمہ دار ہے تو کیا کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ کالج کے تمام پروفیسر اور طلبہ پرنسپل کے غلام اور نوکر ہیں۔ حالانکہ سب پر اس کی اطاعت تو فرض ہے۔ اسی طرح ایک مملکت کے وزیر اعظم کو لیجیے۔ وہ سربراہ مملکت، نگران اور ذمہ دار ہے تو کیا سارے وزراء اور حکومت کے دوسرے کارندے وزیر اعظم کے غلام اور بندۂ بے دام ہوتے ہیں۔ حالانکہ سب کے لیے اس کی اطاعت ضروری ہوتی ہے وہاں یہ قانون کیوں لاگو نہیں ہوتا۔ سب وزیروں اور حکومت کی تمام مشینری کو مساوات اور آزادی کے نام سے وزیر اعظم کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیوں نہیں کیا جاتا۔ اس لیے سب جانتے ہیں کہ یہاں پرنسپل یا وزیر اعظم کی ذات کی اطاعت مطلوب نہیں بلکہ حکومت کے دستور، قانون اور قواعد و ضوابط کی اطاعت ہوتی بھی ہے اور کرائی

جاتی ہے۔ وزیر اعظم کی حیثیت اس کے بغیر کچھ نہیں کہ مملکت کے دستور اور قانون کی پابندی کرانے کی ایک ایجنسی ہے۔ بعینہٖ یہی حال عورت کے لیے مرد کی اطاعت کرنے کا ہے بلکہ اسلام نے تو یہ بنیادی اصول سکھایا ہے کہ لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق یعنی جہاں خالق کے احکام کی خلاف ورزی ہو وہاں مخلوق کی اطاعت کرنا ہی گناہ ہے۔ تو عورت کے لیے مرد کی اطاعت کا مفہوم اس کے بغیر اور کیا ہے کہ یہ دراصل اللہ کی اطاعت ہے جو مرد کے ذریعے عورت سے کرائی جاتی ہے۔ کیونکہ اس سٹیج میں مرد ہی اللہ کے قانون کی نمائندگی پر مامور ہے اس لیے جب عورت کو مرد کے خلاف ابھارا جائے گا تو اصل مقصد یہ ہے کہ عورت کو اللہ و رسولؐ کے خلاف بغاوت کے لیے ابھارا جائے۔ چنانچہ یہ ہو کے رہا۔

ماضی قریب میں اسلام بیزار "مسلمان" خواتین نے جو احتجاجی جلوس نکالا تھا اس میں مطالبہ یہی تو تھا۔ رسول کا حکم نامنظور، اللہ کا قانون نامنظور، قرآن کا حکم نامنظور۔ یہ وہ مقام ہے جہاں باطل نے "مساوات" کے راستے سے عورت کو پہنچا دیا ہے۔

قوامیت کا مفہوم یہی تو ہے کہ مثالی عورت وہ ہے جو اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کو شیوہ بنائے اور گھر کے نگران کی رہنمائی میں اس اطاعت میں غفلت اور کوتاہی نہ آنے دے۔ ظاہر ہے کہ اس میں مرد کی غلامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ دوسری صورت میں اللہ و رسولؐ کے خلاف بغاوت کا ثبوت ملتا ہے۔ کیونکہ اگر کوئی سپاہی یا افسر جبرئیل کی اطاعت کرنے سے انکار کر دے تو اسے حکومت کا باغی تصور کیا جاتا ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ جبرئیل اس سے اپنی اطاعت نہیں کرا رہا بلکہ حکومت کے قانون کی اطاعت کراتا ہے جس حکومت کا وہ نمائندہ اور نگران مقرر ہوتا ہے۔

مثالی عورت کی دوسری صفت اور خوبی بتائی کہ حافظات للغیب یعنی وہ حفاظت کرنے والی ہے۔ حفاظت کا تعلق ان چیزوں سے ہوتا ہے۔ جو قیمتی ہوں، اہمیت کی حامل ہوں اور محبوب ہوں اور انسان کے پاس بلا امتیاز تین چیزیں اس نوعیت کی پائی جاتی ہیں۔ عزت و آبرو، مال و دولت

اور اولاد۔ گو اہمیت کے اعتبار سے ان میں فرق مراتب ہے یعنی ایک کی حفاظت کے لیے دوسری کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ ان تینوں کا تعلق جہاں ایک طرف عورت کی ذات سے ہے وہاں دوسری طرف خاوند سے، کنبہ برادری سے اور معاشرے سے بھی۔ ان تین کے علاوہ ایک چیز ایسی ہے جس کا زیادہ تر تعلق اپنی ذات سے ہے اور وہ ہے اپنی جان کی حفاظت — ان میں سے ہر ایک کی حفاظت کے انداز مختلف ہیں۔ مثلاً عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے اپنی ذات پر ہی نظر نہیں ہوتی بلکہ خاندان، قوم اور نوع انسانیت پر بھی نگاہ رہتی ہے اور مسلمان عورت کے لیے عزت و آبرو وہ ہوتا ہے جو اسلام نے اس کے لیے مقرر کیا ہے۔ اس معیار میں کئی امور پیش نظر رہتے ہیں مثلاً تمدنی معاملات میں یہ دیکھنا کہ اپنا ہے یا پرایا ہے، محرم ہے یا نامحرم ہے، اجنبی ہے یا شناسا ہے۔ دوست ہے یا دشمن ہے۔ ان تمام کے لیے اسلام نے جو حدود مقرر کر دی ہیں ان کا خیال رکھنا عزت و آبرو کی حفاظت کرنا ہے — اسی طرح مال و دولت کی حفاظت کا بھی سلیقہ ہے۔ مثلاً سب سے پہلے یہ دیکھنا کہ مال ذاتی ملکیت ہے یا خاوند کا ہے اور میں اس کی امین ہوں۔ اگر اپنا ہے تو اس کے استعمال میں مجھے کامل آزادی ہے یا پابندی بھی ہے۔ اگر اسلام نے اس سلسلے میں کوئی پابندی عائد کی ہے تو اسے خوشی سے قبول کرنا اور اس کے مطابق اس سے کام لینا ذاتی مال کی حفاظت ہے اور اگر خاوند کا مال ہے تو امین کی حیثیت سے مالک کی ہدایات کے مطابق اس میں تصرف کرنا مال کی حفاظت کہلائے گا اور اولاد کی حفاظت بڑا وسیع میدان ہے نہایت کٹھن کام ہے۔ کیونکہ اس میں اولاد کی جان، اس کی صحت اس کی غذا وغیرہ کا صحیح اہتمام پھر اس کی تربیت، تعلیم، اخلاق و عادات کی حفاظت جان جوکھوں کا کام ہے۔ یہ اتنا عظیم مقصود ہے اور ایسا ہمہ وقتی توجہ کا تقاضی ہے کہ عورت کو جان کھپانی پڑتی ہے۔ اس کے باوجود اگر اس پر کوئی اور ذمہ داری ڈالی جائے تو یہ عورت پر ظلم ہے مگر کہتے ہیں جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے۔ اب عورت اس ظلم کا مطالبہ کرتی ہے۔ وہ دفتر میں کلرکی کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ وہ میدان میں ہاکی کھیلنے کا تقاضا کرتی ہے۔ وہ کچہری میں وکیل بن کر معاشی

طور پر آزاد ہونا چاہتی ہے ــــ یہ تو درست ہے جو وہ چاہتی ہے وہ اسے مل جائے گا۔ مگر وہ عورت نہیں رہے گی اور اپنے گھر کو ویران بنا دے گی۔ اور حفاظت کے یہ تینوں خانے خراب کر کے چھوڑے گی اور وہ مرد مؤنث کسی صورت میں بھی مثالی اور معیاری عورت قرار نہیں دی جا سکتی

یہاں حفاظت کے ساتھ ایک اور لفظ کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور وہ ہے للغیب کا۔ اس نے عورت کی عظمت کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ مشاہدہ یہ ہے کہ آدمی کسی کے سامنے اس کے ساتھ جو رویّہ اختیار کرتا ہے وہ اس سے مختلف ہوتا ہے جو اس کی غیر حاضری میں اختیار کیا جاتا ہے ــ اور ایسا کرنا ان لوگوں کا کام ہے ــ جو ابن الوقت، کوتاہ بیں ریاکار بہروپیئے اور ایکٹنگ کے عادی ہوں ان کی ہر حرکت دکھاوے کی اور ہر ادا محض show کے لیے ہوتی ہے اور یہ اداکاری دراصل انسان کی ذات کی نفی ہوتی ہے۔ انسانی سیرت میں یہ بہت بڑا عیب ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ایک عارف کی پیش گوئی پوری ہوگئی کہ

سے عجب نہیں کہ رہے نیک و بد میں کچھ نہ تمیز
کہ جو بدی ہے وہ سانچے میں ڈھلتی جاتی ہے

چنانچہ یہ اداکاری اب خوبی بن چکی ہے اور نخمدہ و نصلی پڑھ کے اداکاروں کو میڈل اور ایوارڈ دیے جاتے ہیں۔ مگر اسلام چاہتا ہے کہ مثالی عورت کے کردار میں اس تصنع اور بناوٹ کو دخل نہ ہو بلکہ اس میں خلوص ہو ایثار ہو للّٰہیت ہو خیر خواہی کا جذبہ ہو۔ اس تمام منظر کو اللہ کریم نے ایک لفظ "غیب" میں سمو کے رکھ دیا ہے۔ یعنی مثالی عورت وہ ہے جو خاوند کی موجودگی میں محض اسے دکھانے کے لیے حفاظت کی ایکٹنگ نہ کرے بلکہ پورے خلوص سے پوری دلسوزی سے اس کی غیر حاضری میں بھی اس کا رویّہ وہی ہو جو اس کی موجودگی میں ہو سکتا ہے یہ ہے عورت کی عظمت کا نقطۂ عروج۔

مثالی عورت کی یہ خوبیاں بیان کرنے کے بعد اللہ کریم نے ایک امر کا اضافہ فرمایا ہے کہ "بما حفظ اللہ" یعنی یہ کام اتنا کٹھن ہے کہ کوئی عورت اپنی قوت و قابلیت کے بل بوتے پر اس سے عہدہ برآ ہونا چاہے تو مشکل ہے عورت اگر پورے خلوص سے یہ کمال حاصل کرنا چاہیے تو اللہ اس کی حفاظت کرے گا۔ مدد کرے گا توفیق دے گا۔ اسباب فراہم کرے گا۔ حالات سازگار بنائے گا۔

اب ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جو قادرِ مطلق ہے وہ اگر مددگار ہو وہ حامی و ناصر بن جائے، تو انسان کی کامیابی میں کوئی رکاوٹ کھڑی ہو سکتی ہے۔ کوئی شک باقی رہتا ہے۔ یوں لگتا ہے۔ جیسے عورت کا یہ خلوص رحمت الٰہی کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے مقناطیس کا کام دیتا ہے۔

بس اسلام کی نگاہ میں مثالی عورت وہ ہے جس میں یہ خوبیاں پائی جائیں اور ان خوبیوں کا ماحصل یہ ہے کہ ایسی عورت اپنی ذات کے لیے خاوند کے لیے خاندان اور کنبہ کے لیے قوم کے لیے بلکہ پوری انسانیت کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہوگی۔ اس کے اعضاء و جوارح انسانیت کی تعمیر، تہذیب اور تزئین میں مصروف ہوں گے اور اس کے دل کا رشتہ رضائے الٰہی کے ساتھ جڑا ہوا ہوگا۔ سچ کہا عارف لاہوری نے ؎

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری

سہ روزہ اجتماع اور مرشد آباد روانگی

جمعرات ۸۸-۲-۴ دارالعرفان سے مرشد آباد

جمعۃ المبارک ۸۸-۲-۵ اختتام سہ روزہ اجتماع

بعد از نماز جمعۃ المبارک دارالعرفان۔

ارشادِ نبویؐ

و بہترین مسلمان وہ ہے، جس کے ہاتھ اور زبان سے اس کے ہمسائے محفوظ رہیں۔

و نماز مومن کی معراج ہے۔

المُرشد

دینی رسالہ ہونے کے ساتھ سلسلۂ عالیہ کا ترجمان بھی ہے۔ اس کے ساتھ تعاون آپ کا دینی فریضہ ہے۔

(سفرِ چترال کی رپورٹ)

ہم بھی وہیں موجود تھے

(ملک نسیم)

جناب سجاد صاحب کے ہمراہ جب میں چترال ایئرپورٹ پر پہنچا تو سائرن بج رہا تھا۔ سائرن تمام دنیا میں خطرے کی علامت کے طور پر بجایا جاتا ہے مگر چترال میں اس کی آواز مژدۂ جانفزا سے کم نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آج وہ مبارک دن ہے جب پی آئی اے کا فوکر لواری ٹاپ کو عبور کر کے پہنچا ہی چاہتا ہے۔ یہ جدید آواز کانوں کو کتنی بھلی لگتی ہے اس کا جواب صرف وہی لوگ دے سکتے ہیں کہ جن کی چترال سے واپسی کے وقت چترال دیر روڈ بند ہو جائے اور خراب موسم کی وجہ سے پروازیں چند ہفتے معطل ہو جائیں ایسے میں جہاز کے ٹکٹ کی قیمت اگر آسمان سے نہیں تو کم از کم جہاز سے ضرور باتیں کرنے لگتی ہے۔

۲۶ اکتوبر ۸۰ء ایک ایسا ہی مبارک دن تھا جب حضرت مولانا محمد اکرم دامت برکاتہم صرف تین دن کے مختصر دورے پر چترال تشریف لا رہے تھے۔ سجاد صاحب نے بجائے کتنی دعا ہائے نیم شبی پی آئی اے کے اس خوش قسمت جہاز کی آمد کی نذر کر دیں۔ جہاز ڈنگا ڈنگا پرواز کرتا آیا۔ اسی طرح ہی اترا، ٹیکسی کر کے ایک فوکرانہ شان کے ساتھ ہمارے سامنے کھڑا ہو گیا اور مسافر اترنے لگا۔

اگرچہ پشاور سے فون پر تصدیق ہو چکی تھی کہ حضرت اسی پرواز پہ تشریف لا رہے ہیں۔ مگر تقریباً سارے مسافر اتر گئے۔ اور ہم سراپا انتظار ہی رہے۔ سجاد صاحب نے سوالیہ

نشان بن رہی تھی۔ میری طرف دیکھا ہی تھا کہ ڈاکٹر بٹر صاحب نظر آ گئے (براہ کرم اس لفظ کا تلفظ ہلیکوپٹر کے پیٹ سیج فرمالیں۔ یہ لفظ ب پیش ٹ پر زبر سے ہے یعنی "بُٹَر")۔

حضرت دامت برکاتہم مسکراتے ہوئے جہاز سے باہر تشریف لائے۔ دیکھ کر دل بھی مسکرانے لگا۔ ساتھ میں جناب کرنل صاحب اور محمود تھے۔ اس دفعہ جناب کرنل صاحب بھی کافی خوشگوار موڈ میں تھے۔ وہیں ہوائی اڈے پر حضرت اقدس کو چائے کا ایک کپ پلایا اور اپنی اگلی منزل کو روانہ ہوئے — حضرت کی جیپ میں چلا رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب پیچھے بیٹھے تھے۔ جناب کرنل صاحب کی جیپ سجاد صاحب چلا رہے تھے۔ چترال سے نکل کر حضرت نے پوچھا: "اب کہاں کا ارادہ ہے؟" میں نے عرض کیا "کافرستان کے پار شیخان دہ میں میرے ایک دوست رہتے ہیں، وہ آپ سے ملاقات کے مشتاق ہیں ان کی دعوت پر ان کے گھر جا رہے ہیں" — یہ کافرستان کا پروگرام ہم نے جان بوجھ کر ترتیب دیا تھا۔ میرا پختہ یقین ہے کہ اللہ والے جس راستے سے بھی گزر جاتے ہیں اس پر اپنے نقوش کف پا ضرور ثبت کر کے جاتے ہیں۔ ان کی موجودگی کے مثبت اثرات پورے علاقے میں مدتوں محسوس ہوتے رہتے ہیں۔ اس بات کے پیش نظر ہم نے یہ سوچا کہ حضرت دامت برکاتہم کو اس طرف ضرور لے جائیں۔ عین ممکن ہے کہ رب کریم اس وادی کی ہدایت کا فیصلہ فرما دیں۔

اس طرف کا راستہ کافی تنگ اور پرپیچ ہے۔ میں احتیاط سے جیپ چلا رہا تھا۔ حضرت فرمانے لگے "میری طبیعت مہم جو اور خطر پسند ہے۔ اس طرح کے راستے مجھے بڑے اچھے لگتے ہیں۔ میرا یہ طریق ہے کہ زندگی سے مکمل طور پر لطف اندوز ہونا چاہیے۔ اس کے ہر حسن کی داد دینی چاہیے۔ اسی طرح موت کو بھی پوری ہمت اور مردانگی سے گلے لگانا چاہیے۔ نسیم، میں نے ایسے لوگوں کو مرتے دیکھا ہے جن کے پاس حسن عمل کی کوئی قابل ذکر دولت نہ تھی مگر وہ بھی مردانہ وار اس گھاٹی سے گزر گئے۔ ہمارے اوپر تو رب کریم کی عظیم رحمت ہے کہ اپنے دین کی اشاعت کی خاطر یہ سفر کرا رہا ہے — اگر اس راہ میں موت آ جائے تو اس سے بڑا انعام اور کیا ہو! ویسے رب کریم کا نظام اتنا ڈھیلا نہیں کہ موت اپنے مقررہ وقت سے ایک

"نہیں پتہ کب یا بعد آ سکے۔ اگر ہماری ملاقات فرشتۂ اجل سے اسی سامنے والے موڑ میں ہونی ہے تو یقین کرو کہ اس سے کوئی مفر نہیں ۔۔۔ تو کیوں نہ اس زندگی کا ہر لمحہ جو رب کریم کی عطا ہے اس سے بھرپور لطف اٹھایا جائے" آگے چل کر فرمایا:

"والدین کی ڈانٹ اور شیخ کی تنبیہ دونوں ایک ہی طرح ہوتی ہیں۔ دونوں کی بنیاد محبت اور انداز بے ساختہ ہوتا ہے۔ والدین کے علاوہ جو بھی ڈانٹتا ہے اس کی نظر ضرور عواقب پر ہوتی ہے کہ نجانے میری اس ڈانٹ کا ردِ عمل کیا ہو۔ مگر جب والدین یا شیخ اظہارِ ناراضگی کرتے ہیں تو چونکہ انہیں اپنے رشتے پر پورا اعتماد ہوتا ہے اس لیے نہ تو وہ ردِ عمل کی پرواہ کرتے ہیں اور نہ ہی الفاظ کا تکلف ۔۔۔ شیخ کی سرزنش میں بھی محبت کا پہلو ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس سرزنش سے اتنا فائدہ ہوتا ہے جو عام حالات میں نہیں ہو سکتا۔" معاً مجھے حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ یاد آ گئے ۔۔۔

"وت تو میرا پتر نئیں! اولاد کو سمجھانا تو والدین کا حق ہوتا ہے۔" میری آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ راستہ دھندلا گیا ۔۔۔

میں نے گاڑی کو بریک ماری۔ کیلاش قبیلے کے گاؤں شروع ہو چکے تھے۔ ساتھ ہی دائیں جانب ان کا قبرستان تھا۔ حضرت نے قبرستان دیکھا۔ میں بھی پیچھے چل پڑا۔ قبرستان کی حدود میں ایک عجیب سی بدمزگی کا احساس ہوا تو میں لوٹ آیا۔ جناب کرنل صاحب کی جیپ بھی پہنچ گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم وادی کے آخری سرے پر اپنے میزبان مولانا عبدالجلیل صاحب کے گھر پہنچ چکے تھے۔ مولانا عبدالجلیل صاحب کا لکڑی کا دو منزلہ خوبصورت گھر بمبریت نالے کے اس پار واقع ہے۔ ایک چشمے کو موڑ کر گھر کے اندر سے لے گئے ہیں۔ پہاڑ کے عین دامن میں بے حد خوبصورت اور پُر فضا مقام ۔۔۔ میں نے زندگی بھر ان کی مکئی سے زیادہ میٹھی مکئی، ان کے ٹماٹروں سے زیادہ رسیلے ٹماٹر اور ان کے لوبیا سے زیادہ مزیدار لوبیا نہیں کھایا۔

مغربی چترال میں کیلاش قبیلہ تین وادیوں میں مقیم ہے ۔۔۔ بمبریت، رمبور اور بریر۔ ان میں سے بمبریت میں ان کی آبادی سب سے زیادہ ہے جہاں ان کی کُل تعداد تقریباً اڑھائی ہزار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس وادی کو بے پناہ حسن سے نوازا ہے ۔۔۔ دونوں اطراف

سے بلند و بالا پہاڑوں کے بیچ گہری وادی کے درمیان صاف شفاف بیریت نالہ بہتا ہے۔ جس کا پانی ٹھنڈا بھی ہے اور میٹھا بھی —— اخروٹ، سیب اور انگور بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں کے اخروٹ سارے چترال میں بہترین مانے جاتے ہیں۔ کہنے کو ان کیلاشوں کا کوئی مذہب نہیں مگر سُنا ہے کہ وہ بھی چوری چھپے ایک لکڑی کے گھوڑے کے سر کی پُوجا کرتے ہیں۔

مولانا عبدالجلیل صاحب چشم براہ تھے۔ حضرت دامت برکاتہم سے ان کی پہلی ملاقات تھی — باقاعدہ بتانا پڑا کہ حضرت کونسے ہیں۔ میرے قریب آکر آہستہ سے سرگوشی کے انداز میں پوچھا "یہی شیخ ہیں؟" تو میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا — دراصل رستے میں حضرت المکرم اسی موضوع پر کافی دیر تک گفتگو فرماتے رہے تھے۔ آپ نے فرمایا:

"بعض ناواقف احباب کو تعجب ہوتا ہے کہ یہ کیسا شیخ ہے جو اپنے سارے کام خود کر لیتا ہے۔ حالانکہ اس راہ میں مشکل ترین مقام یہی ہے کہ انسان اپنے سینے میں تمام تجلیات جذب کرنے کے باوجود عام آدمی کی طرح بالکل نارمل نظر آئے۔ جس طرح سمندر کی تہ میں اُٹھنے والے طوفان اس کی سطح کے سکون کو متاثر نہیں کرتے اسی طرح ایک صوفی کو اپنے حرکات و سکنات پر مکمل کنٹرول ہونا چاہیے"

ہم مولانا صاحب کے گھر گئے۔ کھانا کھایا! ظہر ادا کی اور وہ حضرت المکرم مدظلہ العالی کو وہاں کے حالات بتانے لگے۔ کہنے لگے یہاں پر تقریباً ساری دنیا کے سیاح آتے ہیں۔ مسلمان بھی اور غیر مسلم بھی۔ ہم یہاں کے کافروں کو اکثر تبلیغ دین کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ نے تو کہہ بھی دیا کہ مولانا آپ ہمیں کس اسلام کی دعوت دیتے ہیں؟ آپ لوگ ہم سے کونسے مختلف ہیں؟ آپ مسلمانوں کی بدکاری، چوری اور فراڈ کے تو ہم خود عینی گواہ ہیں۔ آپ سے تو ہم کافر ہی بھلے ہیں۔" بات اگرچہ تلخ تھی پر بالکل حق تھی — میں سوچتا رہا کہ، ہم مسلمان عموماً الا ماشاء اللہ اس بدترین جرم کے مرتکب ہیں کہ ہمیں دیکھ کر لوگ اسلام پر اُنگلیاں اُٹھاتے ہیں۔ پھر مولانا نے اپنی ایک مشکل بیان کی کہ اگر ان میں سے کوئی مسلمان ہو بھی جائے تو میرے پاس قدر وسائل نہیں کہ اسی قدر مناسب رہائش و

تربیت کا بندوبست کرسکوں۔ حضرت نے فرمایا کہ ہم اس معاملے میں حتی الوسع آپ کی مدد کرنے کو تیار ہیں۔ ہم انشاء اللہ آپ کو دوائیاں کمبل اور غلہ بھیجیں گے جو آپ ان نومسلموں میں تقسیم کریں۔ اس کے علاوہ ہم تبلیغ و اشاعتِ دین کے سلسلے میں بھی آپ کی ہر معاونت کریں گے۔" میں دل ہی دل میں خوش ہوتا رہا کہ الحمدللہ حضرت کو یہاں لانے کا مقصد پورا ہوگیا۔

وہاں سے تقریباً دو بجے واپس ہوئے راستے میں ایک نالے کے بیچ عصر ادا کی۔ اور مغرب سے کچھ قبل سجاد صاحب کے گھر میرکھنی پہنچے۔ میرکھنی دریائے چترال کے کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ وہاں سے ایک سڑک جنوب مغرب کی طرف سرحدی قصبہ ارندو کو جاتی ہے۔ میرکھنی کی اکلوتی پیداوار یہاں کا بچھو ہے جو گرمیوں میں پایا جاتا ہے۔ تعداد ناقابلِ بیان، سائز ناقابلِ یقین اور ڈنگ ناقابلِ برداشت ——— مغرب کے بعد حضرت نے خطاب فرمایا۔ پھر محفلِ ذکر منعقد ہوئی۔ اس کے بعد عشاء ادا کرکے آپ آرام کے لیے اپنے کمرے میں تشریف لے گئے۔

صبح تہجد کے وقت حضرت کا کمرہ بالکل بھر گیا۔ کافی تعداد میں احباب ذکر کے لیے جمع ہوگئے تھے۔ پھر نمازِ فجر کے لیے آپ مسجد تشریف لے گئے۔ نماز کے بعد آپ نے مختصر سا درس قرآن پاک دیا ——— ناشتے کے بعد ارندو جانے کا پروگرام بنا ——— آج بھی الحمدللہ حضرت دامت برکاتہم کی جیپ میں چلا رہا تھا ——— راستے میں میں نے عرض کیا، "حضرت کیا انسان پر حجت قائم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر انسان پر ایک (لمحۂ معرفتِ حق) آئے جس میں وہ حق کو بالکل واضح طور پر سامنے دیکھ لے؟"

حضرت نے فرمایا "معرفتِ حق کا تعلق بنیادی طور پر حق و باطل میں تمیز کرنے والی اس صلاحیت سے ہے جو رب کریم نے ہر انسان کو عطا فرمائی ہے۔ اگر کسی انسان نے وہ صلاحیت گنوائی نہیں تو اس پر یقیناً وہ لمحہ آتا ہے، جب حق اس کے سامنے بالکل صاف و واضح ہو جاتا ہے۔ اگر اس کے بعد بھی وہ انکار کر دے تو ایسے کفر کو جہدی کفر کہتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی اپنے برے اعمال کی وجہ سے وہ

صلاحیت ہی گنوا دے تو اس پر یہ ملبہ نہیں آتا۔
ایسے کافر پر دوہری فردِ جرم عائد کی جاتی ہے۔
ایک تو انکارِ حق کا جرم اور دوسرا اس صلاحیت
کو کھو دینے کا — جس طرح ایک فوجی اپنے
وائرلیس کو خود توڑ دے اور بعد میں کہے کہ مجھے
تو یہ کام کرنے کا حکم ہی نہیں ملا تھا تو اس پر
دو چارج لگیں گے۔ ایک کام نہ کرنے کا اور
دوسرا وائرلیس توڑنے کا —"

پھر آپ نے تبلیغِ دین کے متعلق فرمایا:
"مبلغ کو یہ بات کبھی نظر انداز نہیں کرنی چاہیے
کہ دین انسانوں کے لیے آیا ہے۔ ہم انسان
پہلے ہیں مسلمان بعد میں — دین کوئی زبردستی
ٹھونسنے کی چیز نہیں۔ بلکہ تبلیغ میں بھی
انسانی ہمدردی کا پہلو پیشِ نظر رہنا چاہیے۔
جس آدمی کے دل میں جتنی زیادہ ہمدردی ہوگی
اس کی تبلیغ میں اتنا زیادہ اثر ہوگا —
ہمارے بیشتر مسلمان تبلیغِ دین میں شدت اختیار
کرتے ہیں جس کی وجہ سے عام آدمی دین سے
متنفر ہو جاتا ہے —"

ہم ارندو پہنچ چکے تھے۔ نالے کے
اس پار افغانستان کا قصبہ بری کوٹ تھا۔
ہم تھوڑی دیر گھومے — ایک جگہ چائے پی
اور واپس ہوئے۔ راستے میں میں نے حضرت
کی خدمت میں عرض کیا "کیا ہر گناہ کے بدلے
میں لازماً وہی عذاب ہوتا ہے؟"

آپ نے جواباً ارشاد فرمایا: "عذاب
کا تعلق لازمی طور پر اعمال سے ہوتا ہے —
یہ تعلق دو طرح کا ہوتا ہے — ایک تو گناہ
کرنے والے کا ارادہ اور دوسرے طریقہ۔
عذاب کی شدت کا تعلق ارادے سے ہوتا
ہے جبکہ عذاب کی نوعیت کا انحصار طریقِ
گناہ پر ہوتا ہے۔" میں نے عرض کیا "کیا یہ
ممکن ہے کہ کسی انسان کی برزخی حالت دیکھ
کر اندازہ کر لیا جائے کہ یہ آدمی دنیا میں
کیا کیا کرتا تھا؟"

آپ نے فرمایا "ہاں یہ ہو سکتا ہے —
ہم نے کل جو کیلاشیوں کا قبرستان دیکھا تھا،
ان میں سے ایک عورت کی جو برزخ میں
حالت میں دیکھتا ہوں اس سے یوں محسوس
ہوتا ہے کہ وہ بدکاری کی مجرم تھی۔"

ہم تقریباً دوپہر کو واپس میرکھنی پہنچے —
ظہر کے بعد حضرت دامت برکاتہم نے دس میل
دور دروش کی جامع مسجد میں خطاب فرمانا تھا۔
اگرچہ وہاں کے چند احباب حلقے کے متعلق

سرسری سا علم رکھتے تھے مگر تفصیلی تعارف تا حال نہیں ہوا تھا۔ خطاب کے اختتام پر وہاں کے شیخ جامو نے حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت جس ذکر کی طرف آپ نے اپنے خطاب میں دعوت دی ہے براہِ کرم مجھے اس کا طریقہ بھی تعلیم فرما دیجئے۔ حضرت نے طریقہ بتا دیا اور ارشاد فرمایا کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہم پانچ منٹ اس طرح ذکر بھی کر لیں۔ وہ بزرگ بڑی خوشی سے تیار ہو گئے اور ان کے ہمراہ تمام حاضرین بھی ذکر کے لیے بیٹھ گئے۔ محفلِ ذکر کے بعد حضرت نے رخصت چاہی تو وہ بزرگ فرمانے لگے کہ آپ براہِ کرم ہمارے ساتھ چائے کا ایک پیالہ پی کر جائیں۔ چنانچہ حضرت وہیں بیٹھ گئے۔ وہاں پر ایک اور عالم دین بھی تشریف فرما ہوئے۔ جنہیں وہاں بلبلِ چترال کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ وہ حلقے سے کافی حد تک متعارف تھے اور المرشد کا مطالعہ بھی کرتے رہتے تھے۔ جب چائے پی چکے تو وہ بزرگ کہنے لگے حضرت مجھے براہِ کرم بیعت فرمالیں۔ ان کے بعد بلبلِ چترال، ان کے صاحبزادے، اور مزید چھ اصحاب بھی بیعت ہو گئے۔ سجاد صاحب اس صورتِ حال کے لیے قطعاً تیار نہیں تھے۔ ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس پہلے تعارفی خطاب کے بعد کوئی بیعت بھی ہو گا۔ اس لیے وہ بیعت فارم وغیرہ سے لیس نہ تھے۔ پس لگے جلدی جلدی نام لکھنے۔

حضرت نے واپسی راستے میں فرمایا کہ یہ رب کریم کا کتنا کرم ہے کہ جس نے اپنے مبارک نام کی دعوت عام کرنے کے لیے ہم جیسے ناکارہ لوگوں کو قبول فرما لیا۔ الحمد للہ پاکستان کا کوئی کونہ ایسا نہیں جہاں تک ہم نے سفر نہ کیا ہو۔ اب تو بفضلِ تعالیٰ دنیا کے ایک کثیر حصے میں اس کا نام اس کے چاہنے والوں کے قلوب گرماتا ہے۔ رب کریم جس تیزی سے اس مبارک حلقے کو وسعت عطا فرما رہے ہیں، اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ انشاء اللہ ایک دن یہاں دین کا غلبہ ہو گا۔"

عصر کے بعد میر کھنی میں دوبارہ مختصر سی محفل ذکر منعقد ہوئی۔ پھر مغرب کے بعد حضرت نے ایک قریبی قصبے کی مسجد میں خطاب فرمایا۔ اور ذکر کرایا۔ اس محفلِ ذکر کے بعد بھی کافی احباب حلقہ ارادت میں شامل ہوئے۔ آپ نے چترال کے اس دورے میں اپنے تمام خطابات میں اللہ کے ذکر کی اہمیت کو اجاگر کیا اور اس

بنیادی نکتہ پر زور دیا کہ ذکر اللہ ایک علیحدہ اور مستقل عبادت ہے۔ اگرچہ باقی تمام عبادات بھی ذکر کے دائرے میں آجاتی ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی اس کا نعم البدل نہیں جیسے نماز بھی اللہ کا ذکر ہے مگر نماز ہی ذکر اللہ نہیں ہے بحیثیت عبادت، ذکر اللہ کا اپنا منفرد اور مستقل وجود و وجوب ہے۔ دروش کے خطابات کے دوران تو آپ نے ایک بات کہہ دی جس نے رشتۂ الفت کے متعلق میری فکر کو ایک نیا رُخ بخش دیا۔ آج تک میں اس انگریزی کہاوت پر یقین رکھتا تھا کہ محبت دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتی ہے۔ پر آپ نے فرمایا کہ محبت کا تعلق محبوب کی قوتِ جذب سے ہوتا ہے۔ جس محبوب میں یہ قوت جتنی زیادہ ہوگی اسی قدر اس کا محب مجذوب ہوگا۔

آقائے نامدار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودِ اطہر میں یہ قوت جذب سب سے زیادہ تھی، یہی وجہ ہے کہ چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود مسلمان کا دل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق سے لبریز ہے اور وہ اپنی تمام کائنات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم اقدس پر نچھاور کر دینے کو اپنی عظیم ترین سعادت گردانتا ہے۔

۲۸ اکتوبر کو واپسی تھی۔ صبح کی نماز کے بعد تیاری کی۔ حضرت دامت برکاتہم، ڈاکٹر عظمت اور میں ایک گاڑی میں تھے۔ جبکہ جناب کرنل صاحب اور محمود دوسری میں۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی جب ہم نے سجاد صاحب کو الوداع کیا۔ راستہ کچا اور خراب تھا اس لیے سفر آہستہ آہستہ جاری رہا۔ میں نے حضرت کی خدمت میں عرض کیا "حضرت! سائنس کی رو سے جو چیز جتنی لطیف ہوتی ہے، اسی قدر قوی بھی ہوتی ہے۔ اور ہر طاقت ور چیز کمزور اشیاء کے افعال کو متاثر کر سکتی ہے؟"۔ آپ نے فرمایا "بالکل کر سکتی ہے اور کرتی ہے اور یہ اس قدر لطیف وجود ہے کہ دوسرے وجود کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ مثلاً یہ ایک جن کے جسم میں سے، جو کہ خود وجودِ لطیف ہے گزر سکتی ہے اور جن کو اس کا احساس تک نہیں ہو پاتا۔ لیکن جہاں تک اختیاری طور پر کسی فعل کو متاثر کرنے کا تعلق ہے تو یہ ایک علیحدہ شعبہ ہے جس کے لیے تربیت کی ضرورت ہے۔"

میں دل ہی دل میں گھبرا رہا تھا کہ میرے

سوالات کی نامعقولیت کی بنا پر حضرت کہیں مجھے
چُپ ہی نہ کرادیں۔ پر آپ کے حوصلہ افزا جواب
کی وجہ سے میں نے ایک اور سوال پوچھ لیا ——
عرض کیا" حضرت! یہ جو دوسرے غیر محسوس اجسام
سے رابطہ ہے، کیا اس کی صلاحیت ہر انسان میں
ہوتی ہے؟" آپ نے فرمایا " ہاں ہر انسان
میں ہوتی ہے، کچھ میں زیادہ کچھ میں کم۔ لیکن
یہ (رابطہ)
بھی ایک علم ہے جس کی تربیت کے دوران شیخ
کو خصوصی توجہ دینی پڑتی ہے۔ جنات کو یہ
وصف وہبی طور پر عطا کیا گیا ہے۔ اسی طرح
صوفی کی روح بھی COOMMNICATE ضرور
کرلیتی ہے چاہے اس کو اس کا ادراک ہو سکے
یا نہ۔"

لواری ٹاپ کی طرف چڑھائی شروع ہوگئی
نیچے اپنی سڑک کے پندرہ پندرہ موڑ نظر آرہے
تھے۔ سڑک کے کناروں پر برف پڑی ہوئی تھی۔
متوقع برف باری کے پیش نظر سڑک تقریباً خالی
تھی۔ ایک ٹرک خرابیٔ بسیار کے ساتھ اس
پھسلن دار بل کھاتی سڑک پر آہ و فغاں کرتا جارہا
تھا۔ سردی کافی بڑھ گئی، بادل جیپ میں اندر آنے
لگے۔ حضرت کی خدمت میں جب اگلی بات کی
تو مجھے یقین تھا کہ آپ میری جہالت پر ضرور
خندہ زن ہوں گے۔ میں نے آپ سے توجہ اور
القا کا فرق دریافت کیا۔ آپ نے نہایت شفقت
سے میرے اس طفلانہ سوال کا جواب مرحمت
فرمایا۔ ارشاد فرمایا" توجہ دراصل فیوض و برکات
کے اس مستقل انتقال کا نام ہے جو نسبتِ معیت
کی وجہ سے سینۂ شیخ سے سالک کے سینہ کی طرف
ہوتا ہے جبکہ القا، ایک عارضی ارتکازِ توجہ ہے
جو کسی خاص وقت، کسی خاص مقصد کے پیش نظر
کیا جائے۔"

ہم لواری ٹاپ پر جناب کرنل صاحب کے
انتظار میں رُک گئے۔ نجانے ڈاکٹر صاحب نے
کس طرح چھُپ کر اپنی جیبیں اخروٹوں کی گری
سے LOAD کرلی تھیں۔ اس بلندی پر اس
سردی میں ان کی یہ ضیافت مزہ دے گئی ——
جناب کرنل صاحب پہنچے تو اس یخ بستہ
موسم میں شعلہ بر اندام تھے۔ معلوم ہوا کہ ان کی
گاڑی میں سردی، بارش اور ہوا تیغوں کی
در آمد کا خاطر خواہ بندوبست تھا۔ اس لیے ہم
سب اب حضرت والی گاڑی میں ہو لیے ——
اخروٹوں کی ایک مٹھی بھر کھیپ پیش کی اور
بمشکل راضی کیا۔ (باقی صـ ۳۷ پر)

ایک اپیل، ایک التجا

(ایک بیٹی)

مشرق کی بیٹی کون ہے! یہ وہ نازک آبگینہ ہے جس کا سواگت اس دنیا میں ٹھنڈی آہوں کی چھاؤں اور بیزاری کی نگاہوں تلے ہوتا ہے۔ اور جب یہ بیٹی شعور کی پہلی حد پار کرتی ہے تو اپنے آپ کو اپنے پیاروں پر ایک بوجھ پاتی ہے لیکن زبان سے کچھ کہہ نہیں سکتی۔ جب اس سے ذرا آگے بڑھتی ہے تو اپنے آپ کو شادی بیاہ کی منڈی میں ایک بکاؤ مال کی طرح پاتی ہے۔

جہاں بولی اُس کے حسن کردار پر نہیں اُس کے ساتھ آنے والے جہیز پر دی جاتی ہے اور اس طرح کوئی مالدار آسامی اُس کی بولی دے کر اس کو جہیز کی سُولی چڑھا جاتی ہے اور اس کے اپنے اور اس کے پیارے زیادہ جہیز کو بیٹی کے سُکھ کی ضمانت سمجھ کر اس سُولی کو کاندھے پہ اُٹھائے رکھنے کی کوشش میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ لیکن اس بیٹی کو زبان کھولنے یہاں تک کہ آنسو بہانے کی بھی اجازت نہیں۔ آخر ایک دن جو کہ دنیا والوں کی نظروں میں خوشیوں اور اُمنگوں کا دن ہوتا ہے، وہ اس سُولی سے لاشے کی طرح اُتار کر سسرال کے جہنم میں جھونک دی جاتی ہے۔ جس کا پہلا شعلہ جہیز کی کمی پر طعنوں کی شکل میں لپکتا ہے اور اس کے احساسات کو جلا دیتا ہے اور اس کی نظروں کے سامنے اس کے پیاروں کی وہ ساری قربانیاں گھوم جاتی ہیں، جو اسے جہیز کی تیاری میں ان کو دینا پڑیں لیکن وہ کچھ کہہ نہیں سکتی، کیونکہ یہاں بھی بہو کے آداب میں خاموشی شرط ہے۔ خواہ اس پہ ہزار قیامتیں ایک ساتھ ہی کیوں نہ گذر جائیں۔ اس پچھلے خاندان کی کم حیثیتی اور حسن گھٹ کرنے کے الزامات کی بھرمار کر کے اس کو کس طریقے سے ایذا دی جاتی ہے یہ اس زندہ لاش کو معلوم ہے جو کبھی بیٹی تھی یا اس کے خدا کو۔

پھر اگر اولاد کی باری آنے پر وہ بیٹی کو جنم دیتی ہے تو اس کا خمیازہ بھی اُسی کو بھگتنا پڑتا ہے۔ جیسے کہ یہ سب اسی کا قصور ہے اور اس کی سزا بھی اُسی کو ملنی چاہیئے۔ اور اگر بیٹے کو جنم

دیتی ہے تو اس کے پیاروں کی شامت کہ بیٹے کی پیدائش پر دھوم دھام سے آدھے جہیز جتنی چیزیں اور زیورات بھر لے کر آجائیں تو ان کی بیٹی کی خوشیوں کی ضمانت سمجھی جائے گی۔ حالانکہ ان بیچاروں کو یہ نہیں معلوم کہ جس بیٹی کی خوشیاں خریدنے کے لیے وہ اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں محض اس لیے کہ وہ اپنی بیٹی سے بے حد پیار کرتے ہیں۔ وہ خوشیاں اس کا مقدر کبھی نہیں بن سکتیں۔ کیونکہ بحیثیت بیٹی کے خواہ اس میں سارے زمانے کے گن ہوں، بحیثیت بہو کے اس میں کوئی خوبی نہیں ہوتی۔ صرف نقائص رہ جاتے ہیں۔ بحیثیت بیوی کے وہ صرف درجۂ سوم کی شہری ہے جسے مرد یہ حیثیت دیتا ہے کہ عورت تو پاؤں کی جوتی ہے جسے جب چاہا بدل لیا اور وہ زندگی کے دن اسی کشمکش کے عذاب میں گذارتی ہے کہ کب خاوند نے دوسری شادی رچالی اور اس کو اور اس کے بچوں کو گھر سے باہر دھکیل دیا۔ گویا کہ بہو بننے کے بعد اس بیٹی کی شکل ایسی مسخ ہوتی ہے کہ اس کو اپنے آپ کی پہچان بھی نہیں رہتی۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود اسے زبان کھولنے کی اجازت نہیں۔ اس بیٹی کی حالت گندم کے اس دانے جیسی ہوتی ہے جو گندم کے ڈھیر سے اٹھا کر چکی میں پیسنے کے لیے ڈال دیا جائے۔ لیکن جہاں نہ تو وہ آٹے کی شکل میں فنا ہو سکے اور نہ اس گندم کے ڈھیر میں واپس جا سکے، صرف چکی کے دو پاٹوں میں پستا رہے۔

یہ ایک بگڑے ہوئے مسلمان معاشرے کی بہو اور بیٹی کی تصویر ہے جو آج اس سوچ میں مستغرق ہے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے کے کافر عرب اگر اپنی بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ گاڑ دیا کرتے تھے۔ تو کیا وہ ٹھیک نہیں کرتے تھے؟ اگر انہیں پال پوس کر اتنی محبت اور شفقت دینے کے بعد ساری عمر کے نفرت اور کمتری کے جہنم میں جھونکنا ہے تو اس سے انہیں پیدا ہوتے ہی زندہ گاڑ دینا کہیں بہتر ہے۔ میں پوچھتی ہوں جب چودہ سو سال پہلے عورت کی سیاہ تقدیر حق کے نور سے لکھ دی گئی ہے تو پھر آج کی مسلمان عورت اس ظلمت سے کیوں دوچار ہے؟ اس کے وہ حقوق جو اسے خدا اور اس کے رسولؐ نے دیئے ہیں وہ کب اس کا مقدر بنیں گے؟ وہ کب تک ایک کمتر بہو اور پاؤں کی جوتی سمجھی جاتی رہے گی؟ اور کب تک اپنے پیاروں کے لیے ایک بوجھ ایک ذمہ داری بنے رہے گی؟

میری آپ سے اپیل ہے کہ اگر آپ بیٹی کے ماں باپ یا بڑے بھائی ہیں تو اسلام نے جو اس کو یہ حق دے رکھا ہے کہ وہ اپنی شادی اپنی رضا سے کرے، تو اس سے یہ ضرور دریافت کریں کہ وہ جہیز کی سولی پر لٹکنا چاہتی ہے؟

یا نہیں! کیا اسے دولتمند گھرانا اپنانے یا نہیں ہو سکتا ہے وہ اس سولی پر لٹکنے سے بہتر سمجھے کہ اپنا بوجھ خود اٹھائے۔

اور اگر آپ لڑکے کے ماں باپ یا بھائی بہن ہیں تو خدارا ان پراگندہ رسموں سے اس بیٹی کی جان چھڑانے کی بھرپور کوشش کیجئے۔ جو اس معاشرے کو کوڑھ کی طرح لگ گئی ہیں۔ جس طرح آج کل لوگ جہیز لینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں آپ جہیز نہ لینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائیے۔ لڑکی کے والدین دینا بھی چاہیں تو انہیں سختی سے منع کیجئے۔ اور پھر اپنے گھر کو اس کے لیے جہنم نہ بنا دیجئے بلکہ اس گھر میں اس کا جو مقام ہے وہ اسے دیجئے۔ کیونکہ حقوق چھین لینے والوں سے پوچھ گچھ تو ضرور ہوگی۔ ایسا نہ ہو کہ حشر کے روز آپ کی بیٹی یا آپ کی بہو ہی سب سے پہلے آپ کی دامن گیر ہو۔ کیونکہ جن کو یہاں انصاف نہیں ملا ان کی حشر کے روز تو سنی جائے گی۔

یہ چکی کے دو پاٹوں میں پستی ہوئی ایک بیٹی کی التجا ہے۔ خدارا اس پر دھیان دیجئے۔ اتنا کچھ اس لیے لکھ ڈالا کہ ہو سکتا ہے میرے آواز اٹھانے سے میری کسی دوسری بہن کا بھلا ہو جائے۔ ؎

شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے میری بات

بقیہ: ارشاد السالکین

کر کے دیکھ لے۔ کسی میدان میں مقابلہ کر لے۔ میں سائیکل سے لے کر ہوائی جہاز تک چلا سکتا ہوں۔ اللہ کا احسان ہے مجھ پر۔ اور میں نے ریوالور کی گولی سے پرندوں کو شکار کیا ہے۔ آج بھی کر سکتا ہوں۔ آپ کا جدید اسلحہ میرے لیے کھلونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں اپنی روزی اللہ سے لیتا ہوں اور اپنے ہاتھوں سے پیدا کرتا ہوں۔ میں آج بھی کاشت کرتا ہوں اور ہزاروں اللہ کے بندے اسے کھاتے ہیں۔ مجھے خدا نے نہ رزق کے لیے کسی کا محتاج کیا ہے۔ نہ عملی زندگی کی جدوجہد کے لیے۔ میں گلگت (خنجراب) سے موٹر کے سٹیرنگ پر بیٹھا اور میں نے مناڑہ تک چلائی۔ لوگ سکردو سے گلگت ساڑھے چھ گھنٹوں میں جاتے ہیں میں ساڑھے چار گھنٹوں میں پہنچا۔ جہاں لوگ رک رک کر گذرتے ہیں، میں وہاں تیزی سے گزر جاتا ہوں یہ سب اس وجہ سے ہے کہ میں نے کسی کی جوتیاں اٹھائی ہیں۔

رجسٹرڈ آر نمبر ۱۹
دسمبر ۱۹۸۷ء بمطابق ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ

تصانیف حضرت العلام
مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ

تصوف

تعارف	۲/۰
دلائل السلوک خاص ایڈیشن	۴۰/۰
دلائل السلوک انگریزی ایڈیشن	۶۰/۰
اسرار الحرمین	۱۵/۰
ملیم عرفان	۳/-
عقائد و کمالات علماء دیوبند	۷/۰

حیات بعد الموت

سیف اویسیہ	۱۰/۰
حیات برزخیہ	۳۰/۰
حیات انبیاء	۱۵/۰
حیات النبی ﷺ مذاہب اربعہ اہل سنت کی نظر میں	۱۰/۰

شیعیت کا تحقیقی مطالعہ

الدین الخالص	۲۵/۰
ایمان بالقرآن	۲۰/۰
تحذیر المسلمین	۲۵/۰
آیات اربعہ	۵/۰
تحقیق حلال و حرام	۵/۰
حرمت ماتم	۵/۰
ایجاد مذہب شیعہ	۵/۰
شکست اعدائے حسین	۴/۰
داماد علی	۲/۵۰
بنات رسول	۳/۰
الجمال والکمال	۵/۰

تصانیف حضرت مولانا محمد اکرم صاحب مدظلہ

اسرار التنزیل حصہ اول	۱۰/۰
اسرار التنزیل 〃 دوم	۱۰/۰
اسرار التنزیل 〃 سوم	۱۰/۰
اسرار التنزیل 〃 چہارم	۱۰/۰
چار پارے مکمل و مجلد	۵۰/۰
دیار حبیب میں چند روز	۵/۰
ارشاد السالکین I	۴/۵۰
امیر معاویہ	۱۰/۰
ماہی کرب و بلا	۲/۰
عصر حاضر کا امام	۱/۰
ارشاد السالکین دوم	۲/۰

تصانیف پروفیسر حافظ عبدالرزاق ایم اے اسلامیات و عربی

ذکر اللہ عربی	۲/۰
لغزشیں	۱۰/۰
اطمینان قلب	۱۵/۰
تصوف و تعمیر سیرت	۱۰/۰
کس لئے آئے تھے ؟	۸/۰
خدایا ایں کرم بار دگر کن	۱۰/۰
بزم انجم	۲۰/۰
دین و دانش	۱۰/۰
کونوا عباد اللہ	۳/۰
انوار التنزیل	۷/۵۰
مغالطے	۵/۰

ماہنامہ المرشد چکوال

بیاد
حضرت العلام مولانا
اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی
حضرت مولانا محمد اکرم صاحب مدظلہ

اصلاح احوال، باطنی اصلاح

بدل اشتراک

سالانہ چندہ	۷۵/۰۰
ششماہی	۴۰/۰۰
فی پرچہ	۷/۰۰
تاحیات	۵۰۰/۰۰

— بیرون ممالک —

سعودی عرب، کویت، سری لنکا

بھارت سالانہ چندہ	۱۶۰/۰۰
متحدہ عرب امارات، مسقط	۱۸۰/۰۰
یورپ	۲۰۰/۰۰
لیبیا	۲۰۰/۰۰
امریکہ، کینیڈا	۲۲۵/۰۰
تاحیات	[illegible]

— سول ایجنٹ —

اویسیہ کتب خانہ
الوہاب مارکیٹ
اردو بازار، لاہور

ملنے کا پتہ: ادارہ نقشبندیہ اویسیہ دار العرفان منارہ ضلع چکوال